1

علمی و تحقیقی جریدہ

ششماہی

# نور معرفت

اسلام آباد

محرم/جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ

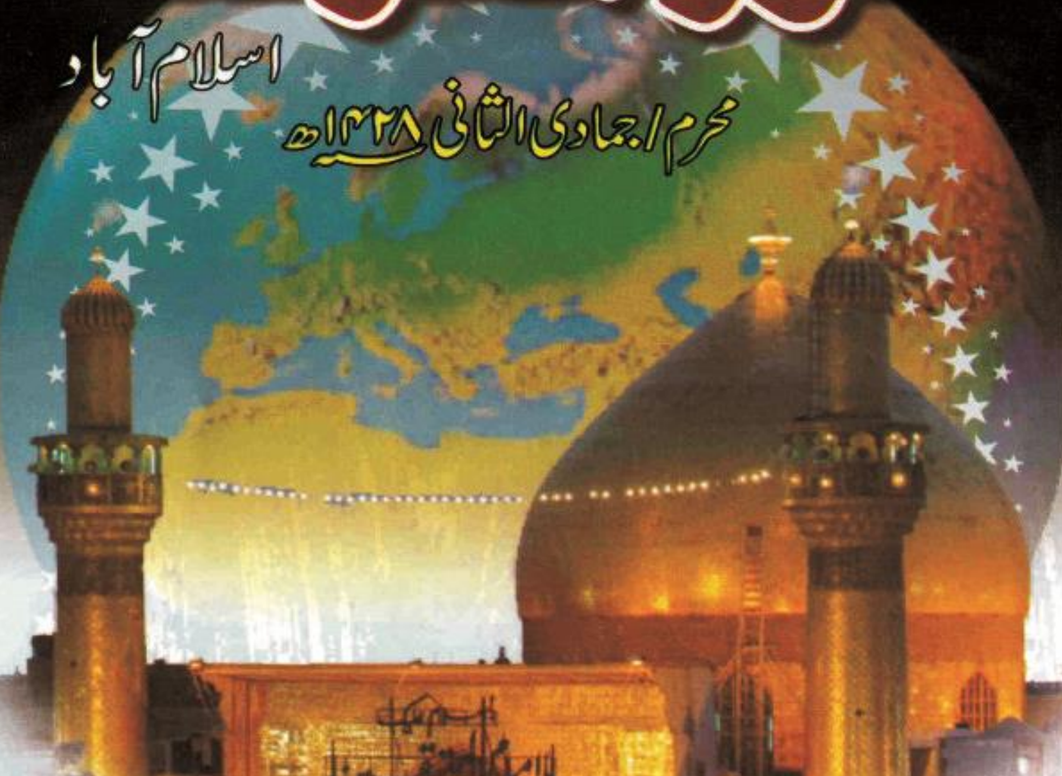

یکی از مطبوعات

**نورالھدیٰ ٹرسٹ (رجسٹرڈ) اسلام آباد**

# علمی و تحقیقی جریدہ

ششماہی **نور معرفت** اسلام آباد

| شمارہ: ۱ | محرم / جمادی الثانی ۱۴۲۸ء | جلد ۱ |
|---|---|---|

صرف ممبران کے لئے



## مجلس ادارت

سید حسنین عباس گردیزی — سید ثمر علی نقوی

سید جعفر خوارزمی — محمد اصغر عسکری

سید فرحت علی کاظمی — جعفر علی میر

## مجلس مشاورت

سید نثار علی ترمذی — ڈاکٹر حسنین نادر

اقرار حسین جعفری — ملک اعجاز حسین

## پیشکش

جامعۃ الرضا، بہارہ کہو، اسلام آباد

## مدیر

سید رمیز الحسن موسوی

**نگران طباعت و سرکولیشن**: سید محمد علی ترمذی



یکی از مطبوعات

# شعبہ تحقیق نور الھدی ٹرسٹ اسلام آباد

## بسم اللہ الرحمن الرحیم

## اس شمارے میں


| صفحہ | مقالہ نگار | موضوع | نمبر شمار |
|---|---|---|---|
| 3 | مدیر | مدارس میں دینی موضوعات پر تحقیق کی ضرورت | 1 |
| 8 | حجۃالاسلام غلام عباس رئیسی | امام حسنؑ کی صلح اور امام حسینؑ کے قیام کا فلسفہ | 2 |
| 34 | حجۃالاسلام سید حسنین عباس گردیزی | شہادت امام حسن کے 40 بعد امام حسین کی حکمت عملی | 3 |
| 40 | حجۃالاسلام سید ثمر علی نقوی | کربلا میں صحابہ رسول ﷺ کا کردار | 4 |
| 72 | حجۃالاسلام محمد اصغر عسکری | اہل بیت علیہم السلام کی عزاداری | 5 |
| 92 | سید رمیز الحسن موسوی | امام حسین اور تقیہ | 6 |
| 121 | حجۃالاسلام سید جعفر خوارزمی | عاشورہ حسینی کے تناظر میں؛ تکامل انسان اور عورت کا کردار | 7 |
| 143 | سید نثار علی ترمذی | کربلا کی شعری روایت | 8 |
| 155 | سید فرحت علی کاظمی | قیام کربلا اور حسینی عزت | 9 |
| 169 | سید محمد علی ترمذی | کتابیات امام حسینؑ | 10 |

**ابتدائیہ**

# مدارس میں دینی موضوعات پر تحقیق کی ضرورت

## The Need for Research on Religious Topics in Madaris

مدارس اور حوزہ ہائے علمیہ اسلام کے وہ محکم قلعے ہیں کہ جن کے کمزور ہونے سے اسلام کے کمزور ہونے کا خطرہ ہے اور جن کے محکم و مستحکم ہونے سے اسلام کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں یہ وہ حقیقت ہے کہ جس سے کوئی بھی صاحب عقل ودانش انکار نہیں کر سکتا۔جس معاشرے میں دینی مدارس اور علمی مراکز نے اپنی ذمہ داریاں پوری کی ہیں اور اپنے مقصد کے لئے پوری دیانتداری کے ساتھ کام کیا ہے، وہ ہمیشہ معاشرہ دینی اقدار کا علمبر دار رہاہے اور اس معاشرے میں احکام الٰہی کی حاکمیت کی برکت سے انسانوں نےپُرامن زندگی گذاری ہے لیکن جہاں بھی اِن مراکز نے اپنی ذمہ داریوں سے غفلت برتی ہے تو وہاں مسلمان معاشرہ انواع واقسام کی آفات کا شکار ہو گیا ہے۔

چونکہ دینی علماء اور اسلامی مراکز کی سب سے بڑی ذمہ داری اسلامی معاشرے کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ دینی احکام کی نشرواشاعت اور لوگوں کی زندگی کو اسلامی احکام کے سانچے میں ڈھالنا ہے اور اسلام کے خلاف کھلنے والے ہر محاذ کا مقابلہ کرتے ہوئے اسلام کو قرآن اور سنت کے سرچشمہ سے لیکر بغیر کسی کمی بیشی کے آئندہ نسلوں تک منتقل کرنا ہے اور اسلام میں ہر قسم کی بدعت کے دروازے بند کرکے اس الٰہی امانت کو تحریف و تبدل کے خطرات سے محفوظ رکھنا ہے ۔دینی مدارس اور مراکز جہاں بیان کے ذریعے اسلام کی نشرواشاعت کے امین ہیں، وہیں قلم کے ذریعے بھی اسلامی ورثے کو محفوظ رکھنے کے ذمہ دار ہیں۔

لہٰذا اسلام کو جدید چیلنجوں اورجدید سوالات اور شبہات کے مقابلے میں تر وتازہ رکھنا دینی مراکز اور علمائے دین کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔ اس مقصد کے لئے اِن مراکز میں درس وتدریس کے ساتھ ساتھ اسلامی موضوعات میں تحقیق و تصنیف کا کام انتہائی ضروری ہے۔ ہمارے اسلاف اور قدیم علماء

نے جو علمی ورثہ ہمارے لئے چھوڑا ہے اور جن عظیم الشان علمی ذخیروں کے بل بوتے پر آج ہمارا دینی وعلمی تشخص قائم ہے، وہ انہی مدارس اور حوزہ ہائے علمیہ کے اندر درس وتدریس کرنے والے علماء کی دن رات کی محنت کا نتیجہ ہے جنہوں نے ناکافی وسائل کے باوجود عظیم الشان کتابیں تالیف کیں اور اسلام کے خلاف اُٹھنے والے ہر سوال کا علمی جواب دیا ہے اور کسی بھی دور میں معاندین کے شبہات کا جواب دینے سے پہلو تہی نہیں کی۔آج دین اسلام کو سخت ترین سوالات اور شبہات کا سامنا ہے۔

ٹیکنالوجی اور علم وصنعت کے اس دور میں اگر علمائے دین جدید تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے فقط قدیم انداز میں درس وتدریس اور وعظ وبیان تک محدود رہے اور تحقیق و جستجو کا میدان خالی چھوڑ دیا تو بعید نہیں ہے کہ اغیار اور دشمنان اسلام اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لئے اس میدان کو پُر کرنے کی کوشش کرنے لگیں گے جیسا کہ یہ کام کسی حد تک شروع ہو چکا ہے اور علم و عمل سے عاری نام نہاد محققین اور مستشرقین کی اسلامی تحقیقات سے متاثر اذہان دین کے بارے میں اظہار رائے کرنے لگے ہیں نیز دینی علوم وفنون پر روشن خیالی اور جدیدیت کی آفات حملہ آور ہو چکی ہیں۔ہمارے ملک میں یہ سب کچھ فقط دینی مراکز اور اسلامی مدارس کی اپنی دینی وعلمی ذمہ داریوں سے غفلت اور غیر ضروری اُمور میں دلچسپی کا نتیجہ ہے۔

سالہا سال تک دقیق ترین اسلامی علوم وفنون میں سر کھپانے والے علمائے دین کی ذمہ داری یہ نہیں ہے کہ وہ معاشرے میں آکر کسی ادارے کے انتظامی اُمور سنبھالیں یا کسی پریس یا کتاب فروشی کے منتظم بن جائیں یا کسی سماجی وثقافتی تنظیم کے عہدے دار بن جائیں بلکہ اُن کی سب سے بڑی مسئولیت دین اسلام کا علمی وفکری میدان میں دفاع ہے اور مسلمان معاشروں کو درپیش علمی و ثقافتی مشکلات سے نکال کر اس دور کے مادہ پرستانہ علوم وفنون کے مقابلے میں علمی و معنوی تقویت بخشنا ہے۔آج دنیا ایک گلوبل ویلج کی صورت اختیار کر چکی ہے اور اسے اس صورت حال تک لانے والوں کا مقصد بھی یہی ہے کہ وہ اس دنیا پر اپنا مادی فلسفہ مسلط کر دیں اور خدا اور خدائی احکام کو گوشہ نشین کرکے مادیت اور مادی اقدار کو عام کر دیں۔اُن کی مادی فکر کے نزدیک انسان کی سعادت یہی ہے کہ وہ اس دنیا کے تمام تر مادی لوازمات سے بہرہ مند ہو ورنہ وہ ایک ناکام انسان ہے۔اس لحاظ سے وہ اپنی دانست میں پوری

دنیا کو سعادت مند بنا نا چاہتے ہیں اور پوری دنیا کو ایک ثقافت اور تمدن کا پابند کر کے اپنے اس شیطانی فلسفے کو عملی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔
جس کے لئے وہ ہر اس نظریئے اور فلسفے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں جو ان کے اس شیطانی فلسفے کے راستے میں رکاوٹ بن رہا ہے اور وہ فقط دینی فلسفہ اور فکر ہے جو اس دور کی مادیت کا سب سے بڑا حریف ہے۔اسلئے یہ جنگ مادیت کے علمبر داروں اور معنویت کے داعیوں کی جنگ ہے اور معنویت ومادیت کے مراکز ہی اس جنگ کے متقابل محاذ ہیں۔لہٰذا دینی مدارس اور معنوی تعلیم وتربیت کے مراکز کی ذمہ داری اس لحاظ سے بہت ہی سنگین ہو جاتی ہے۔اُنہیں جہاں مادی محاذ جنگ پر تن من دھن وارنے کی ضرورت ہے وہاں علمی و نظریاتی محاذ پر بھی چو مکھی جنگ لڑنی ہے اور علمی و نظریاتی محاذ ہمارے مدارس اور علمی مراکز ہیں جن کو ہر قسم کے علمی اسلحہ سے لیس کرنا ان اداروں کے منتظمین کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔
پس جو دینی مدرسہ علمی میدان میں اور نظریاتی محاذ پر پیچھے ہے اور اس دور کے جدید سوالات و شبہات کے مقابلے میں خاموش ہے اور اس حوالے سے فکر مندی نہیں دکھاتا تو وہ در حقیقت اپنی اصلی ذمہ داریوں سے غافل ہے۔ہمارے دینی مدارس میں اس وقت علمی و تحقیقی کام کی اشد ضرورت ہے۔اگر ہمارے مدارس کے ذمہ دار افراد کو اس ذمہ داری کی سنگینی کا احساس ہو جائے تو وہ دنیا کے سب کام چھوڑ کر علمی و تحقیقی کام میں لگ جائیں۔البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارے دینی مدارس اور علمی مراکز گوں نا گوں مشکلات و مسائل کا شکار ہیں اور ان میں سے جو درد مند اہل علم علمی میدان میں کام کی صلاحیت رکھتے ہیں اور تحقیقی و تخلیقی کام کرنے کے متمنی ہیں، وہ ان مشکلات کی وجہ سے کچھ بھی نہیں کر پار ہے اور باوجود کوشش کے اجتماعی مشکلات اور ملکی حالات اور وقت ووسائل کی کمی اُنہیں کوئی قابل قدر کام کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔دینی مدارس کی بہت سی مشکلات ہیں جن کا تذکرہ فی الحال ہمارا موضوع سخن نہیں لیکن تحقیق و تخلیق کے حوالے سے ہمارے اکثر مدارس دینیہ ی وسائل کی کمی کا شکار ہیں اور تحقیق و تخلیق کے لئے لازمی وسائل سے محروم ہیں جس کی بڑی وجہ ملک میں دینی طبقات میں تحقیقی کاموں کی حوصلہ افزائی کا فقدان ہے۔
اگر کوئی عالم دین اور مذہبی سکالر اپنی ذاتی دلچسپی اور کوشش کی بنا پر کوئی تحقیقی کام کرتا بھی ہے تو پہلے تو اسے منظر عام پر لانے کا مسئلہ ہوتا ہے اور اگر وہ اس میدان میں بھی اپنی ذاتی قربانی کے

ذریعے کوئی تحقیقی تخلیق بازار علم وادب میں لے بھی آتا ہے تو اس کی وہ حوصلہ افزائی نہیں ہوتی جس کا وہ مستحق ہے۔ اس کے بر عکس عوامی نوعیت کے غیر تحقیقی اور قصے کہانیوں پر مبنی مواد کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ عوام میں علمی ذوق کی کمی اور ارباب اختیار کی جانب سے تحقیقی کاموں کی حوصلہ شکنی ہے۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہمیشہ علمی و تخلیقی کام حکومتوں اور ارباب اختیار کی توجہ کی وجہ سے فروغ پاتے ہیں جس کی مثالیں مسلمانوں خصوصاً بر صغیر کی تاریخ میں فراواں ہیں کہ ارباب اقتدار اور علم دوست مسلمان حکمرانوں نے علمائے دین اور محققین سے کیسے کیسے علمی و تحقیقی کام کروائے ہیں اور سرکاری سرپرستی میں بہت سے علمی ادارے کام کرتے رہے ہیں، جن لوگوں کو مزید وضاحت چاہیے تو وہ حیدر آباد دکن کی علمی تاریخ اور حالیہ دور میں اسلامی جمہوری ایران میں ہونے والے علمی کاموں کو دیکھ لیں۔ البتہ پاکستان میں دینی مدارس کے علمی زوال کا اہم ترین عنصر وسائل کی کمی ہی نہیں، کچھ دوسری مشکلات بھی ہیں جن کو اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا۔

اس وقت بلا تفریق مذہب وملت مسلمانوں کے تمام دینی مراکز میں تحقیقی کام کی طرف رجحان کا فقدان ہے اور مسلمانوں کا کوئی بھی مکتبہ فکر کوئی بھی تحقیقی تخلیقی کام پیش نہیں کر سکا۔ خصوصاً اُردو میں یہ کام بالکل فراموش ہو چکا ہے اور ہمارے دینی مدارس نے سوائے فرقہ ورانہ سوچ اور مواد تیار کرنے یا عوامی مزاج سے تعلق رکھنے والی ''پروڈکشن'' کے اور کوئی ذمہ داری ادا نہیں کی اور اسی کو دین کی خدمت سمجھ رکھا ہے۔ آج ہمارے پڑھے لکھے طبقے میں بھی علمی کتب پڑھنے کا رجحان ختم ہو چکا ہے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان بھی علمی نوعیت کی کتاب یا دینی و علمی اصطلاحات پر مبنی مواد کو ہضم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ علمی رجحان کا یہ زوال ایک دن میں نہیں ہوا بلکہ یہ سب انحطاط ہمارے دینی مراکز کی تدریجی غفلت کا نتیجہ ہے جو مزید روبہ زوال ہے۔ اسی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے نور الہدیٰ ٹرسٹ نے کہ جو ایک دینی ادارہ ہے اور دینی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر اُٹھائے ہوئے ہے، دینی تحقیقات کے کام کا آغاز کرتے ہوئے اپنی تمام تر بے بضاعتی کے باوجود اس میدان میں قدم رکھا ہے اور تمام علم دوست اور

دردمند اہل علم حضرات کو اس کام میں شامل کرنے کا عزم کرتے ہوئے ایک ششماہی تحقیقی جریدے کا آغاز کیا ہے۔ اُمید ہے کہ ہمارا یہ کام علمی مراکز خصوصاً دینی مدارس کے لئے ایک تحرک کا باعث بنے گا اور دوسرے مدارس بھی اپنی اس عظیم ذمہ داری کی طرف متوجہ ہوں گے۔ خصوصاً وہ مدارس و مراکز کہ جو وافر مادی و علمی وسائل سے بہرہ مند ہیں۔

☆☆☆☆☆

# امام حسنؑ کی صلح اور امام حسینؑ کے قیام کا فلسفہ

## Why Imam Hassan(as) Reconcilated but Imam Hussain(as) confrontated

**حجۃ الاسلام غلام عباس رئیسی**

حضرات ائمہ اطہار علیہم السلام کی سیرت اور عملی زندگی میں بہت زیادہ مشترکات نظر آتے ہیں اور یہ ایک مسلم بات ہے۔ بقول اقبالؒ

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری (ع)　　　بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی وشامی

اس اشتراکِ فکر و عمل کی اصل وجہ یہ ہے کہ ائمہ معصومین اور انبیاء الٰہی کا مقصد اور اصول ایک ہے؛ جیسا کہ امام خمینی کا ارشاد ہے کہ اگر سارے انبیاء عظام ایک وقت میں ایک ہی مقام پر موجود ہوتے تب بھی ان کے درمیان ذرہ برابر اختلاف نہ پایا جاتا۔ کیونکہ اگر کہیں بھی انسانوں کے درمیان کوئی اختلاف پایا جاتا ہے تو اس کے چند عوامل ضرور ہوتے ہیں مثلاً:

**الف۔** ان افراد کا ہدف اور نصب العین ایک نہیں ہوتا بلکہ ہر ایک کا مقصد اپنے ذاتی مفادات کا تحفظ ہوتا ہے؛ لہٰذا ان کے درمیان اختلاف ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک مسافر مشرق کو جانے والا ہو اور دوسرا مغرب جانے والا ہو تو یہ دونوں ہمسفر نہیں ہو سکتے اور ایک گاڑی میں دونوں ایک ساتھ سوار نہیں ہو سکتے۔

**ب۔** اختلاف کا دوسرا عامل، افراد کے طریقہء کار کا اختلاف ہوتا ہے۔ مثلاً دین کی خدمت کرنا سب کا ہدف ہوتا ہے لیکن اس ہدف کے حصول کیلئے ایک شخص سیاست یا جہاد کا راستہ اپناتا ہے اور دوسرا شخص علمی اور فلاحی خدمات کی فراہمی کے ذریعے اس ہدف تک پہنچنا چاہتا ہے۔ البتہ اس طرح کے اختلاف کی بھی دو وجوہات ہوتی ہیں:

ا) بعض اوقات متعدد راستے اپنانے کا سبب تقسیم کار ہوتا ہے؛ مثال کے طور پر ایک شخص تعلیم و تربیّت کا شعبہ سنبھال لیتا ہے تو دوسرا عسکری شعبہ اپنا لیتا ہے۔ لیکن دونوں کا ہدف ایک ہی ہوتا ہے اور دونوں

ایک ہی نظام کے اجزاء کی حیثیّت رکھتے ہیں۔ لہٰذا ایسے افراد کے درمیان تعاون کی فضا پائی جاتی ہے اور وہ ایک دوسرے کے کام کی تکمیل کرتے ہیں۔

۲) بعض اوقات ان افراد میں اختلاف کا سبب تقسیم کار نہیں ہوتا بلکہ ان میں سے ہر ایک، اپنی روش کو برحق اور دوسرے کی روش کو باطل تصور کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کلمہء حق کے اِعلاء کیلئے ایک فرد تبلیغ کو صحیح روش اور جہاد و سیاست کو غلط روش خیال کرتا ہے جبکہ دوسرا فرد برعکس نقطہءٔ نظر کا مالک ہوتا ہے۔ ایسے افراد کی مثال ان تاجروں کی سی ہوتی ہے کہ جو ایک دوسرے کو کمزور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اب اگر افراد کے درمیان اختلاف کی نوعیّت پہلی قسم کی ہو تو معاشرے کا ڈاکٹر، استاد، وکیل، تاجر وغیرہ وغیرہ، سیاستدانوں کی مدد کریں گے اور سیاستدان ان کی۔ لیکن اگر اختلاف کی نوعیّت دوسری قسم کی ہو تو اس صورت میں ہر فرد دوسرے کو غلط قرار دے کر اسے کمزور کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور یوں پہلی قسم کا اختلاف اتحاد اور ہمکاری کا سبب بنتا ہے اور دوسری قسم کا اختلاف افتراق اور اختلاف و نزاع کا عامل بنتا ہے۔

۳) اختلاف کا تیسرا سبب، وسائل اور ذرائع کا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً دوستوں اور حامیوں کی وفاداری، تعداد، صلاحیت، مالی ذرائع، اسلحہ و بارود اور دشمنوں کی کمیت و کیفیت و حکمت عملی، حالات اور حالات زمانہ، معاشرہ کا باشعور ہونا یا نہ ہونا وغیرہ وغیرہ۔ مثال کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کو بہتر ایسے ساتھی ملے جنہوں نے کربلا کی اس قربانی کو اتنی عظمت بخشی۔ لیکن امام حسن کے ساتھی ایسے تھے کہ آپ کو دست بستہ دشمن کے حوالے کرنے کا سوچ رہے تھے۔ حضرت امام حسینؑ کا دشمن ایک ناپختہ اور خود خواہ حکمران تھا لیکن حضرت امام حسنؑ کے مد مقابل ایک انتہائی مکار سیاستدان تھا۔

اختلاف کے ان تین عوامل میں سے حضرت امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کے درمیان یقینا پہلے دو عامل، باعث اختلاف نہیں ہو سکتے تھے۔ کیونکہ حضرت امام حسینؑ کا مقصد اور نصب العین رضائے الٰہی اور بس رضی الله رضانا اهل البيت [1] (اللہ کی رضا، ہم اہل بیت کی رضا میں پوشیدہ ہے۔) تھا اور حضرت امام حسنؑ کا مقصد اور نصب العین بھی یہی تھا۔ اب حضرت امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کے درمیان اختلاف، منزل تک پہنچنے کیلئے طریقہ کار کا باہمی اختلاف بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ آپ دونوں امام ہیں اور اپنی مسؤلیت امامت کو معصومانہ صلاحیتوں کے ساتھ سرانجام دیا کرتے ہیں؛ چنانچہ ارشاد نبوی ہے" ابنای هذان امامان قاما او قعدا[2].

بنابریں، حضرت امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کے درمیان اختلاف کا واحد سبب، وسائل، حالات، مدمقابل کی حیثیّت اور دوست و دشمن کا اختلاف ہی ہو سکتا ہے۔ حالات اور وسائل کے اسی اختلاف ہی کی وجہ سے نہ فقط حضرت امام حسن و امام حسین علیہما السلام کے درمیان صلح و جنگ کی صورت میں اختلاف نظر آتا ہے کہ حضرت امام حسنؑ حکومت دے دیتے ہیں اور حضرت امام حسینؑ جنگ کا راستہ اختیار کرتے ہیں بلکہ حضرت امام رضا علیہ السلام بھی ولایت عہدی قبول فرماتے ہیں۔

کردار اور انتخاب کا یہ اختلاف تو خود ایک ہی معصوم کی زندگی میں بھی نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر حضور اکرم ﷺ نے ۱۵ سال تک صبر و تحمل سے کام لیا اور آٹھ سالوں میں اسی (۸۰) کے قریب جنگیں لڑیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے ۲۵ سال تک سکوت اختیار کیا اور پانچ سال میں تین عظیم جنگیں لڑیں۔ حضرت امام حسنؑ نے ابتداء میں جنگ کا راستہ اختیار کیا لیکن آخر میں صلح کر لی اور حضرت امام حسینؑ نے ابتداء میں صلح کا راستہ اختیار کیا لیکن آخر میں جنگ لڑنا پسند فرمایا۔ پس اسی لیے تو رہبر انقلاب اسلامی ایران فرماتے ہیں کہ یہ معصومین چودہ کے بجائے اگر صرف ایک ہی شخص ہوتا جس کی اتنی عمر لمبی ہوتی جتنی چودہ معصومین علیہم السلام کی کل عمر ہے تو جو اقدامات وقت کے تقاضوں کے مطابق ان ہستیوں نے انجام دیے، وہی ایک ہستی بھی یہ سب اقدامات ہو بہو انجام دیتی۔

بنابریں،، ان دو اماموں کی سیاست اور حکمت عملی میں فرق اور اختلاف کے اسباب اور عوامل کو جاننے کیلئے ہمیں معاویہ اور یزید کے درمیان کا فرق، آپ کے دوستوں اور دشمنوں اور عام مسلمانوں کے حالات کا بغور مطالعہ کرنا ہو گا۔ جیسا کہ خود نبی اکرم ﷺ اور حضرت علیؑ کے درمیان اسی وجہ سے حکمت عملی میں فرق نظر آتا ہے۔ اب ہم ذیل میں معصومین علیہم السلام کے درمیان اختلاف کے حوالے سے ایسے ہی عوامل کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

## نفاق اور کفر میں فرق

اگرچہ حدیث نبوی کے مطابق منافق، کافر سے بھی زیادہ امت مسلمہ کیلئے خطرناک ہے لیکن زمانے اور معاشرے کے حوالے سے نفاق کا خطرہ کفر کی نسبت کمتر ہوتا ہے، کیونکہ منافقت کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کا بول بالا ہے اور منافق اپنے کفر کا اعلان بھی نہیں کر سکتا ہے جبکہ اظہار کفر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مسلمان اتنے بے ضمیر اور بے حس ہو چکے ہیں کہ کفر و اسلام کے درمیان ان کے لئے کوئی فرق نہیں رہا۔ بنی امیہ

نے جو کہ دشمن اسلام اور دشمن پیغمبر تھے، اسلام کو نابود کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ہمیشہ ناکام رہے۔ مشرکین مکہ اور حضور کے درمیان ہونے والی تمام جنگوں میں قیادت کرنے والے یا بنیادی کردار ادا کرنے والے اسی قبیلے کے بزرگ تھے لیکن جب فتح مکہ کا موقعہ آیا اور لشکر اسلام کی طاقت اور عظمت کو جب اس خاندان نے دیکھا تو انہیں پتہ چل گیا کہ کفر کا علمبردار بن کر کامیابی کا حصول ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے اندرونی کفر اور بیرونی اسلام (جس کو قرآن نفاق سے تعبیر کرتا ہے) کی روش کو اپنا لیا۔ اوراستسلموا ولم یسلموا یعنی کہ انہوں نے ہتھیار ڈالے لیکن مسلمان نہ ہوئے۔

پھر ابوسفیان کا حضرت حمزہ کی قبر پر جا کر یہ کہنا کہ حمزہ! بادشاہت کے جس درخت کی تم نے اپنے خون سے آبیاری کی تھی، وہ اب ہمارے بچوں کے ہاتھوں کھلونا بنا ہوا ہے۔ پھر حضرت قیس بن سعد بن عبادہ اور معاویہ کے درمیان تبادلہ ہونے والے خطوط کے مضامین اور مغیرہ بن شعبہ کی معروف روایت (مسعودی) جس میں امیر شام نے کہا تھا کہ جب تک نام محمدﷺ کو دفن نہ کرلوں، سکون سے نہیں بیٹھوں گا۔ تو اس قسم کے دسیوں واقعات، تاریخِ اسلام کی کتابوں میں مرقوم ہیں حالانکہ بنی امیہ کے زور شمشیر اور مذہبی تعصب کی وجہ سے اس قسم کی دسیوں تاریخی دستاویزات غائب بھی ہو چکی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اسلام کو نابود کرنا چاہتے تھے کیونکہ اسلامی اصول نہ فقط ان کے خاندانی اور حکومتی مفادات کے منافی تھے بلکہ یہ لوگ خاندانی طور پر بھی اسلام اور حضرت محمدﷺ وآل محمد کے دشمن تھے۔ لہٰذا وہ منتظر تھے کہ ایک ایسا دن آئے کہ مسلمان اعلان کفر کو بھی برداشت کرلیں اور ساتھ ان کی بادشاہت بھی باقی رہے۔ لہٰذا تاریخ بتاتی ہے کہ معاویہ خلیفہ کہلانے کی بجائے بادشاہ کے لقب سے زیادہ خوش ہوتا تھا۔

لیکن معاویہ اپنے دور میں کسی ایسے اظہار کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ للذا جو بھی ناجائز اعمال اس نے انجام دیئے، اس کے لئے دین کا سہارا لیا۔ یہاں تک کہ جب حضرت علیؑ کو وہ سب وشتم کرتا تھا تو پہلے کہتا تھا: "خدایا! تو گواہ رہنا کہ علیؑ نے تیرے دین کو ترک کیا ہے یا اس میں بدعت ایجاد کی ہے۔" لیکن یزید نے کفر کے الفاظ کو علی الاعلان زبان پر جاری کیا۔ جیسا کہ اس حوالے سے یزید کے اشعار معروف ہیں:

لعبت ہاشم بالملک فلا　　　خبر جاء ولا وحی نزل[3]

اور اسی لیے تو مدینہ میں جب مروان نے حضرت امام حسینؑ سے مطالبہ کیا کہ آپ یزید کی بیعت کریں تو امام نے فرمایا: علی الاسلام السلام اذ بلیت الامة براع مثل یزید[4] یعنی یزید کی حکومت، اسلام کی نابودی اور اعلان کفر کے مترادف ہے۔ یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال اٹھے کہ خدا نے خود اسلام کی حفاظت کی ضمانت دی ہے تو پھر حضرت امام حسینؑ نے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا؟ تو جواب یہ ہے کہ خداوند تبارک و تعالی نے انہی اہل بیت اطہار اور قرآن ہی کے ذریعے تو اسلام کی حفاظت کی ضمانت فراہم کی ہے۔ جیساکہ جناب پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: انی تارک فیکم الثقلین کتاب الله وعترتی اهل بیتی ما ان تمسکتم بهما لن تضلوا بعدی ابدا[5] یعنی (میں تمہارے درمیان دو گراں چیزیں چھوڑے جارہا ہوں؛ ایک اللہ تبارک و تعالی کی کتاب ہے اور دوسری میری عترت، میرے اہلبیت ہیں؛ کہ جب تک میرے بعد ان دونوں کا دامن تھامے رہوگے، گمراہ نہ ہوگے۔)

اسی طرح حدیث سفینہ وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کربلا جیسی قربانیوں ہی کے ذریعے (جن کا تفصیلی ذکر فی الحال ممکن نہیں)، خدا دین کی حفاظت کرتا ہے۔ لہٰذا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت امام حسینؑ کیلئے اعلانِ کفر کے بعد خاموشی اختیار کرنا، ناممکن تھا کیونکہ اسلام کی حفاظت آپ کی اور ہر مسلمان کی ذمہ داری تھی۔ اسی لیے تو جناب زینبؑ نے دربار یزید میں اپنے خطاب میں فرمایا: "فواللّٰه لاتمحو ذکرنا و لاتمیت وحینا"[6] یعنی اے یزید! تیرا مقصد ہماری وحی (اسلام) کی نابودی اور محافظ اسلام کو صفحہ ہستی سے مٹانا ہے، لیکن قسم بخدا یہ بات تیرے بس میں نہیں ہے۔

## گناہوں میں فرق

یزید کی حکومت سے پہلے اگر کبھی حکمران گناہ کرتے تھے تو اسے یا تو دوسروں کی نگاہوں سے چھپ کر انجام دیتے تھے یا اس گناہ کے انجام دینے کے جواز کے طور پر بعض جعلی احادیث کا سہارا لے کر پہلے اس گناہ کو شرعی طور پر جائز قرار دیتے تھے اور بعد میں اس کا ارتکاب کرتے تھے۔ ان میں گناہ کو کھلے عام گناہ کے عنوان سے انجام دینے کی جرأت نہ تھی۔ لیکن یزید علی الاعلان گناہ کا ارتکاب کرتا تھا۔ اور اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ اس کی پرورش بھی ایک غیر اسلامی ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ اعلانیہ شراب خوار تھا۔ یزید کی اس اعلانیہ شراب خواری کی گواہی اس وفد نے دی جسے مدینہ سے عثمان ابن محمد ابن ابی سفیان نے شام بھیجا جس میں غسیل الملائکہ جناب حنظلہ کے بیٹے عبد اللہ اور چند اشراف مدینہ شامل تھے۔ انہوں نے

واپس آ کر یہ گواہی دی کہ: و قالوا قدمنا من عند رجل ليس له دين يشرب الخمر۔۔۔"[7] یعنی: "ہم ایک ایسے شخص سے مل کر آ رہے ہیں کہ جس کا کوئی دین نہیں ہے، وہ شراب پیتا ہے۔۔۔" حضرت امام حسینؑ نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ: "یزید رجل فاجر مُعلن بالفسق و مثلی لایبایع مثله[8]" (یعنی یزید ایک فاجر انسان ہے جو کھلے بندوں گناہ کرتا ہے اور مجھ جیسا یزید جیسے کی بیعت نہیں کر سکتا) اسی طرح جب معاویہ یزید کی خلافت کی راہ ہموار کرنے کیلئے اور اس کی بیعت لینے کیلئے مدینہ آیا تو امام عالی مقام اور عبدالرحمٰن ابن ابی بکر، دونوں کا جواب ایسا ہی تھا کہ یزید اعلانیہ طور پر گناہ کرتا ہے اور امیر شام نے بھی اس بات سے انکار نہیں کیا اور یہ نہیں کہا کہ نہیں؛ وہ نیک آدمی ہے اور ایسے گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ حقیقت سب پر عیاں تھی۔ لٰہذا زیاد ابن ابیہ جیسا شقی انسان بھی معاویہ سے کہتا ہے کہ یزید کیلئے لوگوں سے بیعت کا مطالبہ کرنے سے قبل اسے کہیے کہ کم از کم ایک دو سال تک تو مہذب طریقے سے زندگی گزار لے۔

بنابریں، دین اسلام میں گناہ اعلانیہ اور مخفی گناہ میں فرق ہے۔ جہاں ایک انسان کے دسیوں مخفی گناہ معاف کر دیے جائیں گے، وہاں شاید اس کا فقط ایک اعلانیہ گناہ بھی معاف نہ کیا جائے گا۔ کیونکہ مخفی گناہ کرتے وقت صرف انسان اپنے اوپر ظلم کرتا ہے، لیکن معاشرے کو اس کے گناہ سے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچاتا اور نہ ہی وہ شخص اپنے عمل کے ذریعے معاشرہ کو گناہ کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن جب ایک انسان اعلانیہ طور پر گناہ انجام دیتا ہے تو دراصل وہ اپنے اس عمل کے ذریعے گناہ کی قباحت اور برائی کو ختم کر دیتا ہے اور شریعت کی توہین کا مرتکب ہوتا ہے۔ پس ایک طرف تو اعلانیہ اور مخفی گناہ میں فرق ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اہم شخصیتوں کے گناہ اور معمولی افراد کے گناہ میں بھی کافی فرق ہوتا ہے۔

جیسا کہ ایک عرب شاعر کہتا ہے:

اذا كان ربّ البيت بالدّف مولعا  فشيمة اهل البيت الرقص

یعنی: "اگر کسی خاندان کا بزرگ ڈھول بجانے والا ہو تو اس گھر کے باقی افراد رقص کرنے لگیں گے۔" لٰہذا جب مسلمانوں کا حاکم، اسلام کے احکام کا عملی مذاق اڑاتا ہو تو عوام کی کیا حالت ہو گی؟ جب ایک ایسا شخص کہ جس کی ذمہ داری الٰہی حدود کا اجراء ہے، خود شرابی ہو تو شراب کی حد کون جاری کرے گا؟ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن عالم کے ایک گناہ کے معاف ہو جانے سے پہلے جاہل کے ستر گناہ معاف

ہو چکے ہوں گے۔ اور اس کے بر عکس اگر کوئی عالم نیک ہے تو اس کی نیند اور آرام بھی جاہل کی عبادت سے بہتر ہے کیونکہ اہم شخصیات کے نیک یا برے اعمال کا معاشرے پر پڑنے والا اثر انتہائی زیادہ ہوتا ہے۔اسی لیے کہا جاتا ہے:"الناس علی دین ملوکھم"(یعنی لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں)۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم جہنمیوں کی زبانی یہ بات نقل کرتا ہے کہ وہ لوگ بروزِ قیامت کہیں گے

''خدایا! ان سرداروں اور بزرگوں نے ہمیں گناہ پر اکسایا، پس ان کو دُگنے عذاب میں مبتلا کردے۔"

اب ان حقائق کی روشنی میں غور فرمایئے کہ اگر یزید اقتدار پر قابض رہتا اور لوگ اسے خلیفۃالمسلمین اور جانشینِ رسول ﷺ کے طور پر قبول کر لیتے تو کیا اسلام پر عمل کرنے والا کوئی باقی رہ جاتا؟ اور یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ وہ دین جس پر عمل نہ ہو پائے، وہ زندہ دین نہیں کہلاتا۔ زندہ دین وہ ہوتا ہے جو لوگوں کی عملی زندگی میں نظر آئے۔اسی لیے تو قرآن مجید ہر مقام پر ایمان اور عمل صالح باہم دونوں کو باعث نجات قرار دیتا ہے۔ اس حقیقت پر سورۂ مبارکہ العصر گواہ ہے۔ لہٰذا اب تک کی بات کا خلاصہ یہ ہوا کہ یزید سے پہلے کے حکمران اگرچہ گناہ تو کرتے تھے لیکن مخفی طور پر یا گناہ کا شرعی جواز ڈھونڈ کر؛ لیکن یزید علی الاعلان گناہ کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے پہلے کے حکمرانوں کے خلاف اتنے شدید ردّ عمل کی ضرورت نہ تھی جتنی اس کے خلاف ضرورت تھی کیونکہ اس کے ان گناہوں پر خاموشی، اس کی تائید سمجھی جاتی۔ لہٰذا حضرت امام حسینؑ پر یزید کے خلاف قیام ضروری ہو گیا تھا۔ البتہ ہمارے موجودہ زمانے میں بھی مسلمانوں کا یہی حال ہے اور اس دور کے مسلمانوں کو بھی کم از کم سوچنا چاہیے کہ کہیں وہ یزید وقت کی بیعت میں تو نہیں ہیں؟

## ایک طرف شک و شبہ، دوسری طرف مردہ ضمیری

تاریخ کا ہر طالب علم بخوبی جانتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی وفات سے لے کر حضرت علیؑ کو خلافت ملنے تک کسی بھی حکمران نے نہ فقط آل محمد ﷺ کو تنہا کر دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی بلکہ امیر شام کو بھی مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی سیاست پر عمل پیرا رہے۔ اسی لیے رسول خدا ﷺ کی امت، اہل بیت اطہار علیہم السلام کے مقام سے بے خبر رہی اور حضرت علیؑ اور معاویہ کی جنگ کو حق و باطل کی بجائے قبیلۂ بنی ہاشم اور بنی امیہ کے درمیان چلی آنے والی دشمنی کی ایک کڑی تصور کرنے لگی معاویہ کی سازشوں کے

ذریعے حضرت علیؑ تو نعوذ باللہ، بے نمازی قرار پائے لیکن امیر شام کاتبِ وحی کہلانے لگا۔ حضرت علی علیہ السلام قاتلِ عثمان اور ظالم ٹھہرے اور معاویہ خوامخواہ میں خونِ عثمان کا طلبکار اور حق بجانب قرار پایا۔

اب اُس دور میں جنگ مشکل کا حل نہ تھا؛ کیونکہ جنگ میں زیادہ طاقت رکھنے والا غالب آتا ہے، چاہے حق پر ہو یا باطل پر۔ لیکن حضرات آئمہ اطہار علیہم السلام تو محافظِ اسلام ہیں۔ لہٰذا انہیں اگر حکومت کرنے میں اسلام و مسلمین کو خطرہ نظر آئے تو اسے چھوڑ دینے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ حکومت کرنا تو ایک وسیلہ اور ذریعہ ہے اور دین و ایمان کا بچانا ہدف ہے۔ اب اگر ذریعہ اور وسیلہ ہدف کو نقصان پہنچائے تو پھر وہ وسیلہ نہیں بلکہ مانع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر حکومت مقصد میں مانع بن جائے تو حضرت امام علیؑ کی نظر میں بھیڑ کی چھینک سے بھی بدتر ہے؛ لیکن اگر اس کے ذریعے عدل و انصاف کا قیام ممکن ہو تو یہ ایک بہترین چیز ہے۔ للذا اس صورتحال میں ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ لوگ جو کہ حضرت امام علیؑ کو بے نمازی اور مستحق لعن و طعن مانتے تھے یا وہ لوگ جو شک و شبہ میں مبتلا تھے، خود انہیں موقع دیا جاتا کہ وہ اپنی نگاہوں سے بنی امیہ کی حقیقت اور ان کی حقیقی تصویر کو حکومت کے آئینہ میں وہ خود دیکھ لیں اور وہ خود فیصلہ کریں کہ حق کہاں ہے اور باطل کہاں۔ یعنی اگر حکومت سے دستبردار ہونے سے اگرچہ حکومت چلی جاتی ہے لیکن لوگوں کا ایمان محفوظ رہ سکتا ہے اور اہل بیت کی معرفت بہتر ہو سکتی ہے نیز لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت علیؑ اور معاویہ کے درمیان جنگ، اقتدار کی جنگ نہیں بلکہ اسلام کی بقاء یا نابودی کی جنگ ہے اہل بیت یہ قربانی دینے کیلئے تیار ہیں۔

پس حضرت امام علیؑ اور حضرت امام حسنؑ کے زمانے کے مسلمان ایک قسم کے شک و تردید میں مبتلا تھے جس سے انہیں نکالنے کیلئے وقت ملنا چاہیے تھا جبکہ اگر معاویہ کے ساتھ جنگ میں امام جیت بھی جاتے تب بھی یہ شک و شبہ باقی رہ جاتا لیکن جیسا کہ خود حضرت امام حسنؑ نے بھی بتایا اور تاریخی شواہد اور قرائن بھی بتا رہے تھے کہ جیت معاویہ کی ہو گی۔ شام والوں کے غلبہ کی وجوہات بھی نہج البلاغہ میں مذکور ہیں۔ اور جب صلح کے بعد امیر شام کوفہ پہنچا تو اس نے واشگاف لفظوں میں یہ اعلان کیا کہ اس جنگ کا مقصد معاشرہ میں احیاء نماز، روزہ، زکات اور حج وغیرہ نہیں تھا بلکہ مقصد حکومت کا حصول تھا جو حاصل ہو گیا۔ یعنی اس نے خود لوگوں کے شکوک کو دور کر دیا اور اُس کے بعد کے اعمال نے مزید حقیقت کو آشکار کر دیا۔

اب اس صورت میں حضرت امام حسنؑ کا جنگ لڑنا اور صلح نہ کرنا کیا نتیجہ دے سکتا تھا؟ اگر جنگ ہوتی اور امام کو شکست ہوتی تو معاویہ یزید جیسا بے وقوف نہ تھا جیسا کہ اس نے یزید کو اپنی وصیت میں لکھا ہے کہ اگر حسینؑ قیام کریں تو تم انہیں قتل مت کرنا چونکہ وہ فرزند رسول خداﷺ ہیں۔ یہ ایک پختہ سیاستدان کی بات ہے تاکہ کوئی اس پر اعتراض نہ کرسکے ورنہ امام حسن مجتبیٰؑ کو زہر دلوانے والا کون تھا؟ یہی معاویہ ہی تو تھا۔ لہٰذا اگر جنگ ہوتی تو وہ امام حسنؑ کو اسیر کرتا اور پھر انہیں عزت واحترام کے ساتھ آزاد کر دیتا اور پھر بعد میں امام کے خاص ساتھیوں کو شہید کر دینے کے بعد خود امام کو بھی چپکے سے شہید کر دیتا اور ان پر احسان بھی جتاتا اور خود امت کے درمیان نیک نام بھی ہو جاتا۔ فتح مکہ کے وقت جناب حسنین علیہما السلام کے ناناﷺ نے اسے اور اس کے آباء کو جو آزاد کیا تھا، وہ اس کی شرمندگی میں مبتلا تھا۔ اس طرح اسے اس شرمندگی سے بھی نجات مل جاتی اور امام کے ساتھ اس کا کوئی معاہدہ بھی نہ ہوتا جس کا خوف ہر وقت اس کے دل پر چھایا رہتا۔ کیونکہ معاہدہ کی خلاف ورزی کو عرب کے مشرکین بھی برا مانتے تھے۔ یہ معاہدہ ہی تو تھا کہ معاویہ نے حضرت امام حسنؑ کو شہید کرانے کے بعد ہی یزید کیلئے بیعت کے مطالبے کی جرأت کی۔

پس یہاں پر جنگ جاری رکھنا اور شکست کھانا، امام کی جیت نہ تھا بلکہ یہاں پر صلح کرنا اور وہ بھی مشروط صلح، یہی حضرت امام حسنؑ کی جیت تھی چنانچہ مقصد کی جیت، اسلام کی جیت اور اہل اسلام کی جیت امام حسنؑ کی صلح میں مضمر ہو گئی کیونکہ صلح کا سب سے پہلا نکتہ یہ تھا کہ معاویہ کتاب خدا اور سنت رسولﷺ پر عمل کرے گا۔ یہاں حضرت امام حسنؑ کا مقصد پورا ہو چکا تھا اور اب اگر معاویہ کتابِ خدا اور سنتِ رسول خداﷺ پر عمل نہ کرتا تو معاویہ کی باطنی حقیقت اور عہد شکنی اور قرآن وسنت سے انحراف سب لوگوں کے سامنے آجاتا۔ اسی طرح سے صلح کے معاہدے کے بقیہ نکات نے بھی مسلمانوں کو ہر قسم کے شک و شبہ سے نکال دیا اور انہیں عملاً بتا دیا کہ معاویہ کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ فقط اقتدار کے در پے ہے۔

لیکن امیر شام نے اپنے آپ کو بے نقاب ہوتے دیکھ کر ایک نیا منصوبہ تیار کیا اور وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو بے غیرت بنا دیا جائے اور انہیں اجتماعی اور سیاسی احساس ذمہ داری سے محروم کر دیا جائے۔ انہیں حکومت اور سیاست کے مسائل سے لاتعلق کر دیا جائے۔ اور اس نے اس مقصد کے حصول کیلئے انتہائی مکارانہ اور ماہرانہ منصوبہ تیار کیا۔ اس منصوبہ کے مطابق اس نے مخلص مؤمنین اور مسلمین کو قتل کروایا، جیلوں میں ڈالا یا پھر شہر بدر کر دیا۔ ضعیف العقیدہ لوگوں کو مال و دولت یا حکومت عہدے دے کر خریدا اور

عام لوگوں کو جاہل رکھا گیا۔انہیں فقط یہی سمجھایا گیا کہ ان کی ذمہ داری حکومت و سیاست کے امور میں دلچسپی لینا نہیں ہے بلکہ انہیں اپنی روٹی اور کپڑے کی فکر کرنا چاہیے۔

معاویہ کے اسی کردار کی وجہ سے اہل کوفہ کی اکثریت، حق شناس اور حسین شناس ضرور ہو گئی تھی، اور انہیں بہت سارے شکوک و شبہات سے نجات بھی ملی؛ لیکن یہ الگ بات کہ وہ اپنے ذاتی مفادات سے بالاتر کوئی قدم اٹھانے کیلئے تیار نہ تھے۔اسی لئے فرزدق نے حضرت امام حسینؑ کے جواب میں عرض کیا کہ ان کے دل آپ کے ہمراہ اور تلواریں آپ کے خلاف ہیں۔یہی وجہ تھی کہ جناب حضرت مسلمؑ کا ساتھ دینے والے مجاہدوں کو منتشر کرنے کیلئے آنے والی ان کی ماؤں، بہنوں، اور بیویوں کا موٴقف بھی یہی تھا کہ حکومتی مسائل سے ہمارا کیا واسطہ؟

حکمرانوں کی سیاست ہمیشہ یہی رہی ہے کہ عوام کو سیاست سے دور رکھا جائے۔قرآن مجید میں فرعون کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ: فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهُ فَأَطَاعُوهُ[9] یعنی (اس نے اپنی قوم کو ذلیل بنایا تب انہوں نے فرعون کی اطاعت کی) آخر کیا وجہ ہے کہ آج مسلمان ایسے فرعون صفت حکمرانوں کے خلاف بغاوت کرکے، غلامی کی زندگی سے نجات پا کر آزادی کے حصول کیلئے کوشاں نہیں ہیں؟ وجہ یہی ہے کہ حکمرانوں نے ان سے خود اعتمادی چھین لی ہے اور انہیں اپنا بندہ اور غلام بنا لیا ہے۔ جیسا کہ مولا علی علیہ السلام ایسے ہی حکمرانوں کے ان کرتوتوں کے بارے میں فرماتے ہیں: "فيتّخذوا مال الله دولا و عباده خَوَلاً[10] "یعنی: "ان ظالم حکمرانوں نے اللہ کے مال کو اپنے درمیان گردش میں ڈالا اور خدا کے بندوں کو اپنا غلام بنالیا۔"

بنی امیہ اپنی اس منحوس سیاست میں کامیاب ہو چکے تھے۔انہوں نے مخلصین کو قتل عام کرکے یا پابند سلاسل بنا کر یا شہر بدر کرکے، دنیا پرستوں کو مال و دولت و حکومت دیے کر، عوام الناس کو بے وقوف بنا کر یا ذلیل، بے ضمیر اور مردہ ضمیر بنا کر، اسلامی مملکت کے سیاہ و سفید پر قبضہ کر لیا تھا۔اب ان حالات میں عالم اسلام کی اس مشکل صورتحال کے حل کیلئے حضرت امام حسینؑ کے پاس فقط یہی راستہ تھا کہ تبلیغ کے ذریعے مسلمانوں کو بنی امیہ اور حاکموں کے ناپاک عزائم سے باخبر کرتے تاکہ پوری امت اٹھے اور امام حسینؑ نے بھی یہی قدم اٹھایا۔ بلکہ امام حسینؑ سے قبل خود حضرت علیؑ نے بھی اپنے خطبوں میں بنی امیہ کے خطرات سے مسلمانوں کو آگاہ کیا تھا حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متعدد احادیث میں اس

خاندان کے خطرات سے مسلمانوں کو خبردار کر دیا گیا تھا لیکن اموی لابی کی مشینری نے صدرِ اسلام ہی سے پیغام رسالت اور ولایت سے مسلمانوں کو باخبر ہونے نہیں دیا بلکہ جعلی احادیث کے ذریعہ اور سنت پیامبر کے نقل کرنے اور نشر و اشاعت پر پابندی لگا کر حق کو باطل اور باطل کو حق بنا کر پیش کیا۔ اب بدقسمتی سے خود مولا امام حسینؑ کے زمانے میں معمول کی تبلیغ کے ذریعے پیغام حق کو تمام مسلمانوں تک پہنچانا ناممکن ہو چکا تھا۔

اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ مولا امام حسینؑ نے دو مرتبہ اپنے خواص کو اپنا پیغام سنایا۔ ایک تو صحرائے منیٰ میں، حج کے دوران جہاں حاجیوں کی کثرت کی وجہ سے حکومت کے کارندے ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ اس موقعہ پر آپ نے ایک خطبہ کے ذریعے حضرت علیؑ کی شان میں حضورﷺ کی احادیث سنائیں اور سامعین سے درخواست کی کہ وہ ان فضائل کو دوسروں تک پہنچادیں۔ اور دوسرے خطبہ میں آپ نے خواص کی آرام طلبی، مصلحت پسندی، سکوت اور بنی امیہ کے مظالم کو بیان فرمایا۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تبلیغ کے ذریعے امت محمدی کی اصلاح کرنا ناممکن ہو چکا تھا یعنی نہ تو پیغام پہنچانا ممکن رہا تھا بلکہ جن تک پیغام پہنچ چکا تھا، وہ بھی انتہائی مردہ ضمیر ہو چکے تھے۔ چنانچہ حضرت امام حسینؑ کے ایک سفیر نے پھانسی کے پھندے پر بھی لوگوں کو پیغام حسینی سنایا لیکن کوئی قابل ذکر اثر دیکھنے میں نہ آیا۔ امام حسینؑ نے جو قاصد بھیجے تھے انہیں یکے بعد دیگرے گرفتار کرکے شہید کر دیا گیا کیونکہ اگرچہ امت کے اندر بالعموم جہالت تھی لیکن شیعیان علی تو حقیقت سے واقف تھے، یا عام مسلمان جو کہ محب اہل بیت اور دشمن بنی امیہ تھے، وہ بھی حالات سے باخبر تھے لیکن احساس ذمہ داری کے نہ ہونے، حب دنیا اور مردہ ضمیری نے انہیں چلتی پھرتی لاشیں بنا دیا تھا۔

ان حالات میں ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کی رگوں میں خون دوڑا دیا جائے اور مردہ ضمیروں کو زندہ و بیدار کر دیا جائے۔ چنانچہ اس کام کیلئے تبلیغ کافی نہ تھی بلکہ کسی زندہ اور بیدار کر دینے والے اقدام کی ضرورت تھی اور وہ اقدام جان کی قربانی ہی ہو سکتا تھا۔ پس فرزند رسولﷺ نے عزت و احترام کی زندگی کو خیر باد کہا اور ناناﷺ کے دیار کو چھوڑ کر، کربلا کے چٹیل میدان میں قدم رکھا اور پیاس کے ذریعے، خون دے کر، جگر گوشوں کے ٹکڑے اٹھا کر اور بہنوں کی چادریں لٹا کر آپ نے اُن مردہ ضمیر مسلمانوں کو زندہ کر دیا۔ وہ بھی اس طرح کہ وہ لوگ جو زندہ امام کی فیوضات سے استفادہ کرنے کی

اہلبیت نہیں رکھتے تھے، وہ امام کے مقدس خون کی اس قربانی سے بیدار ہو کر وارث حسینؑ کی اطاعت کریں اور اسلام کو بنی امیہ جیسے دشمنان اسلام سے بچائیں۔ خون دینا اور مظلومیت اگر صدائے حق کے ساتھ ہو تو ہی ایسا اثر دکھا سکتا ہے اور اس نے ایسا اثر دکھایا بھی۔ انقلاب کربلا خون کا محتاج تھا نہ کہ صلح یا سکوت کا، اور چونکہ حضرت امام حسینؑ کے پاس صرف اپنی قیمتی جان تھی، سیدانیوں کی چادریں تھیں اور جوانوں اور جانثاروں کی جوانیاں تھیں جنہیں آپ نے راہ دین پر قربان کر دیا۔

لہٰذا امام حسن مجتبیٰؑ کے دور میں امت کی ایک اہم مشکل شک و شبہ تھا جیسا کہ خوارج اسی شک و شبہ کی پیداوار تھے؛ جبکہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے زمانہ کی ایک اہم یا سب سے زیادہ اہم بیماری، امت کی مردہ ضمیری تھی۔ اُس مشکل کا حل صلح میں نہیں تھا بلکہ اس مشکل کا حل فقط خون دینے میں تھا۔ چنانچہ اس صلح سے ایک طرف تو امام حسن علیہ السلام نے خون حسین ابن علی علیہما السلام کو ضائع نہیں ہونے دیا کیونکہ آپ کی صلح نے بنی امیہ کے کریہہ چہرہ سے نقاب اٹھا دیا تھا، اور دوسری طرف خون حسینی نے صلح امام حسنؑ کا مقصد پورا کر دیا اور سن ۶۱ ہجری میں نہ فقط امت کو بیدار کر دیا بلکہ بیداریء امت کا ایک دائمی سامان بھی فراہم کر دیا۔ اگرچہ حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسین علیہما السلام کے صلح اور جنگ میں امتیاز کی وجہ کے طور پر مذکورہ تین قسم کے امتیازات کے علاوہ اور بھی متعدد فرق بیان کئے جا سکتے ہیں لیکن مقالہ میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے یہاں عناوین کے ذکر پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

1. چونکہ امام حسنؑ کا معاویہ کے ساتھ صلح نامہ کے ذریعے معاہدہ ہو چکا تھا، لہٰذا امام حسینؑ نے اس معاہدہ کی پاسداری کرتے ہوئے معاویہ سے تو جنگ نہ کی لیکن یزید کے ساتھ نہ صرف ایسا کوئی معاہدہ نہ تھا بلکہ اس کا اقتدار پر آنا خود اسی معاہدہ کی ایک آشکار خلاف ورزی تھا۔ لہٰذا اس کے ساتھ جنگ کرنے کیلئے آپ میدان میں نکلے۔
2. سقیفہ سے لے کر حضرت امام علیؑ کو ظاہری خلافت ملنے تک اقتدار پر آنے والے حکمرانوں نے ہر ممکن طریقے سے معاویہ کو مضبوط بنایا تھا اور خود معاویہ کی سیاست اور مکاری بھی نمایاں تھی اور اسے دین کو دین اور قرآن کو قرآن کے خلاف استعمال کرنے کا گُر خوب سمجھ آتا تھا لیکن یزید کے پاس ایسی ذہانت نہ تھی۔

3. جس طرح کہ رہبر انقلاب اسلامی ایران بیان فرماتے ہیں: " امام حسین علیہ السلام کے زمانے میں کربلا میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی اگرچہ تاریخ اسلام میں اس وقت تک کوئی مثال نہ تھی لیکن آئندہ کبھی بھی ایسا کوئی واقعہ پیش آسکتا تھا۔ لہٰذا نبی اکرم ﷺ سے لے کر حضرت امام حسنؑ تک ہر معصوم نے اپنے انداز میں ایک خاص اسوہ پیش کیا لیکن حضرت امام حسینؑ پر لازم تھا کہ ابد تک کیلئے ایسا اسوہ پیش کر دیں کہ اگر کبھی دین خطرے میں پڑ جائے اور ایک سچے مسلمان کے پاس دنیا کی سب سے بڑی طاقت کے ساتھ مقابلہ کرنے کیلئے خون و مظلومیت کے علاوہ اور کوئی اسلحہ نہ ہو تو بھی وہ طاغوت سے ٹکرا جائے لیکن کبھی دین کی حفاظت سے دستبردار نہ ہو۔

4. یزید نے تو حضرت امام حسینؑ سے بیعت مانگی تھی اور اس بیعت کے اسلام کی بقاء اور دین کی سلامتی کیلئے منفی نتائج برآمد ہونا لازم تھے۔ لہٰذا حضرت امام حسینؑ بیعت نہ کر سکتے تھے۔ اس کے برعکس جب معاویہ نے حضرت امام حسنؑ کو صلح کی کو شرائط پیش کیں تو صلح کا یہ مطالبہ اور یہ جنگ بندی مشروط تھی حضرت امام حسنؑ نے تو صلح اور جنگ بندی کی یہ شرط رکھی کہ معاویہ کا لقب امیر المومنین نہیں ہوگا حالانکہ لقب اسلامی حکومت کے سربراہ کیلئے ایک خاص لقب اور عنوان کی حیثیت رکھتا تھا۔ پس معاویہ کا مطالبہ جنگ بندی تھا جبکہ یزید کا مطالبہ بیعت۔ جبکہ جنگ بندی تو اسلام اور مسلمین کے حق میں کی جا سکتی ہے لیکن بیعت نہیں کی جا سکتی کیونکہ جنگ بندی میں فریق مقابل کے اعمال اور کردار کی تائید نہیں ہوتی جبکہ بیعت میں حاکم کے تمام ناجائز اعمال کی بھی تصدیق و تائید ہوتی ہے۔

5. صلح امام حسنؑ کے وقت جو مسئلہ در پیش تھا، وہ مسئلہ ء خلافت تھا۔ خلافت کی وہ شکل جو اس وقت موجود تھی، اگرچہ ہمارے لیے اور ہمارے پیشواؤں کی نظر میں اشکال و اعتراض سے خالی نہ تھی لیکن پھر بھی یہ سلسلہ بعض اصلاحات کے ہوتے ہوئے قابل قبول ہو سکتا ہے۔ لیکن یزید کی حکومت تو ملوکیت تھی جو کسی بھی شکل میں قابل قبول نہیں ہو سکتی۔

6. امام حسنؑ کے زمانے میں عالمِ اسلام پر روم کے حملہ کا خطرہ موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اور معاویہ کے درمیان صلح کا معاہدہ طے پانے کی خبر سن کر روم کا لشکر واپس چلا گیا لیکن حضرت امام حسینؑ کے قیام کے وقت عالمِ اسلام کو ایسا کوئی خطرہ لاحق نہ تھا۔

7. جیسا کہ ہم نے مقدمہ میں اشارہ کیا ہے، حضرت امام حسین اور حضرت امام حسن علیہما السلام کے ساتھیوں اور اصحاب میں بھی بڑا فرق تھا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھی ایسے باوفا تھے کہ انکی وفاشعاری نے قیامِ عاشور کی عظمت کو دو بالا کر دیا اور یہی وجہ ہے کہ واقعہ کربلا ابد تک زندہ رہے گا۔ اس کے برعکس، حضرت امام حسن مجتبیٰ کے اصحاب کی حالت سب کو معلوم ہے۔ آپ کے اصحاب میں اکثریّت بک جانے والوں کی تھی اور وہ کسی طور بھی جنگ جاری رکھنے کیلئے آمادہ نہ تھے اور اگر آپ شہید ہو جاتے تو شاید مظلومیتِ امام حسن مجتبیٰؑ کا ذکر کرنے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔ اور یوں آپ کا ہدفِ شہادت ناکام ہو جاتا کیونکہ شہادت کا مقصد تو ابد تک آنے والی نسلوں کو حق اور حقیقت کا پیغام پہنچانا ہوتا ہے اور یہ پیغام رسانی اسی صورت میں ممکن ہے جب شہید کے خون کو زندہ رکھنے والا کوئی نہ کوئی موجود ہو۔

8. حضرت امام حسن مجتبیٰؑ کے دور میں معاویہ نے جناب عثمان کے خون کے مطالبے کا بہانے بنا کر لوگوں کے جذبات کا رخ اپنے حق میں موڑ لیا تھا اور اُس آیہء قصاص کو نعرہ بنا کر بغاوت کی تھی لیکن قیام کربلا میں حضرت امام حسینؑ نے قرآن و سنت کی آیات کی روشنی میں قیام کیا تھا اور یہاں یزید کے پاس بھی لوگوں کو بہکانے کا کوئی حربہ نہ تھا۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ باطل حاکم کے خلاف قیام کرنا اور اسلامی حکومت وجود میں لانا ہر مسلمان پر واجب ہے۔ خصوصاً معصوم امام پر؛ خواہ یزید کے زمانے کی طرح کے انتہائی خطرناک حالات رونما نہ بھی ہوئے ہوں۔ یہ بات خود حضرت امام حسین اور حضرت امام حسن علیہما السلام کے فرمودات سے صاف ظاہر ہے اور اسی طرح قرآن و سنت و سیرت معصومین سے بھی یہ بات واضح ہے لیکن سوال یہ ہے کہ حضرت امام حسن مجتبیٰؑ نے صلح کیوں کی؟ آپ نے قیام کیوں نہیں کیا؟ تو جواب یہ ہے کہ آپ (ع) کے قیام نہ کرنے کی وجہ کچھ ایسی رکاوٹیں اور موانع تھے جن کی وجہ سے قیام کرنا اہل حق کے حق میں نہ تھا۔ چنانچہ نماز پڑھنا، حج پر جانا، روزہ رکھنا وغیرہ واجب ہے لیکن بعض اوقات کچھ مشکلات اور موانع کی وجہ سے یہ وجوب ساقط بھی ہو جاتا ہے ایسی صورت میں ان اعمال کے سرانجام دینے والے سے نہیں پوچھا جاتا ہے کہ تم نے نماز کیوں پڑھی بلکہ نہ پڑھنے والے سے پوچھا جاتا ہے کہ تم نے اسے ترک کیوں کیا۔ یعنی اسلام کا حکم تو اصل میں باطل اور ظالم کے خلاف قیام کرنا ہے نہ کہ سکوت۔

بنابریں، امام حسنؑ کے جنگ نہ کرنے اور صلح کرنے کے لئے دلیل کی ضرورت ہے نہ کہ قیام عاشورا کیلئے۔ لہٰذا صلح امام حسن مجتبیٰؑ کو بہانا بنا کر ظالم حکمرانوں کے سامنے خاموش اور لب بستہ لوگوں کو دلیل پیش کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ حضرت امام حسینؑ کی سیرت کو اپنا کر ایسے فاسق حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے والے مجاہدین کو۔ یہی وجہ ہے کہ خود امام حسن مجتبیٰؑ واجب الاطاعت امام ہونے کے باوجود بھی صلح کی وجوہات اور دلائل بیان فرماتے تھے۔

اگرچہ ان دو ہستیوں کی سیرت سے ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام میں جنگ کے موقع پر جنگ ضروری ہے اور صلح کے موقع پر صلح لازم ہے لیکن یہ سب کچھ وقت کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ہے یعنی اسلام شناسی اور زمان شناسی ہر قسم کی جنگ اور صلح کی بنیادی شرط ہے۔ بنابریں، نہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے درمیان کوئی مزاج کا فرق ہے کہ نعوذ باللہ یہ کہا جائے کہ ایک امام سخت مزاج تھے اور دوسرے نرم مزاج۔ یا پھر بعض دشمنان اہل بیت کی طرح یہ کہا جائے کہ امام حسنؑ عثمانی تھے جبکہ امام حسینؑ علوی عقیدہ رکھنے والے تھے۔ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ "الحسن والحسین امامان قاما او قعداً" لہٰذا نہ تو آپ دونوں کے نصب العین میں کوئی فرق تھا اور نہ ہی دونوں کے طریقہ کار میں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ بھی سن ۵۱ ہجری تک صلح کے حامی تھے جبکہ دوسری طرف قیام کربلا کیلئے خود حضرت امام حسن مجتبیٰؑ نے بھی اپنے بیٹوں کو قربانی دینے کی وصیت کی تھی۔

پس اگر ان دو معصوم اماموں میں کوئی فرق موجود تھا تو وہ فرق حالات کا اور دراصل، یزید اور معاویہ کا فرق تھا۔ اگر کوئی فرق پڑ اتھا تو امت میں فرق پڑ اتھا اور ان دو اماموں کے اصحاب کی وفاشعاری میں فرق پڑ اتھا۔ تو اب آیئے ہم اور آپ مل کر یہ عہد کریں کہ ہم حضرت امام حسینؑ کے اصحاب کی طرح وفاشعار بنیں گے کہ جن اصحاب کے ساتھ شہادت پر حضرت امام حسینؑ بھی فخر محسوس کرتے ہیں اور اپنے اصحاب کی وفا کیتا ئید و تصدیق کرتے ہیں۔ وہ اصحابِ باوفا کہ جن کی زیارت میں آئمہ معصومین علیہم السلام نے بھی "یالیتنا کنا معکم" (اےٓ کاش! ہم بھی تمہارے ساتھ ہوتے) کے الفاظ بیان فرمائے۔ خدا نہ کرے کہ ہماری مثال حضرت امام حسنؑ کے ان اصحاب کی سی ہو جو عہد شکن تھے اور امام کا ساتھ دینے کیلئے دل سے آمادہ نہ تھے۔

☆☆☆☆☆

# حوالہ جات


1۔ موسوعۃ کلمات الاِمام الحسین (ع)، لجنتہ الحدیث فی معہد باقر العلوم (ع)، قم، دار المعروف للطباعۃ والنشر، چاپ سوم، 1416 - 1995، ص397۔

2۔ الشیخ المفید، الارشاد، بیروت، دار المفید للطباعۃ والنشر والتوزیع، 1414 - 1993م، جلد 2، ص، 30۔

3۔ علامہ مرتضی عسکری، معالم المدرستین، جلد 3، بیروت، مؤسسۃ النعمان للطباعۃ والنشر والتوزیع، 1410 - 1990م، ص161۔

4۔ موسوعۃ کلمات الامام الحسین (ع)، ص346۔

5۔ السید البروجردی، جامع احادیث الشیعۃ، جلد 26، قم، چاپخانہ المہر، 1415 - 1373ش، ص103 ۔

6۔ علامہ مرتضی عسکری، معالم المدرستین، جلد، 3، ص، 163۔

7۔ ایضا، ص180۔

8۔ الشیخ عبد اللہ البحرانی، العوالم، الاِمام الحسین (ع)، قم، مدرسۃ الاِمام المہدی (عج) بالحوزۃ العلمیۃ، 1407 - 1365ش، ص174۔

9۔ الزخرف: ۵۴۔

10۔ امام علی علیہ السلام، نہج البلاغۃ، جلد: 3، قم، دار الذخائر، 1412 - 1370ش، ص120۔

# شہادت امام حسنؑ کے بعد امام حسینؑ کی حکمت عملی

## Strategy of Imam Hussain(as) after the Martyrdom of Imam Hassan(as)

حجۃ الاسلام سید حسنین عباس گردیزی*

امام حسین علیہ السلام عالم انسانیت کی وہ عظیم شخصیت ہیں جس نے پورے عالم کے افکار کو متاثر کیا ہے۔ بلا تفریق مذہب وملت ،ہر قوم نے انہیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ شعراء نے اپنے کلام کے ذریعے اظہار عقیدت کیا ہے، مفکرین نے اپنے افکار کو بیان کیا ہے، مورخین نے اپنی کتب میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ امام حسین علیہ السلام کے بارے میں بالخصوص ان کے قیام اور واقعہ کربلا کے متعلق مصنفین نے جتنی کتب لکھی ہیں یا شعراء نے جتنا کلام پیش کیا ہے، دنیا میں شاید ہی کسی اور کے بارے میں ہو۔ واقعہ کربلا کے بعد سے لے کر ہزاروں قلم فرساؤں نے تحریریں لکھی ہیں۔ سینکڑوں کتب، ہزاروں مقالہ جات تحریر کئے گئے ہیں، لیکن پھر بھی اس موضوع پر تشنگی باقی ہے۔ مفکرین جتنا اس پر سوچتے ہیں، فکر کے نئے دریچے کھلتے جاتے ہیں، گفتگو کے نئے رخ سامنے آتے ہیں، موضوع ہر آن تازہ نظر آتا ہے اور اس سب کچھ کا زیادہ حصہ امام حسین علیہ السلام کی زندگی کے اس پہلو پر مشتمل ہے جو کربلا سے متعلق ہے یعنی رجب ۶۰ ھ سے لے کر ۱۰ محرم ۶۱ ھ تک کے حالات وواقعات۔ جبکہ تاریخ انسانیت کی اس عظیم ہستی نے زندگی کے ۵۷ سال بسر کیے ہیں۔ ظاہر ہے ان کی زندگی کا ہر لحہ انسانوں کے لئے ہدایت کا سامان لئے ہوئے ہے۔ ان کی حیات طیبہ کا ہر دور عظیم اور پر اثر ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ واقعہ کربلا سے پہلے کی زندگی اور سیرت پر روشنی ڈالی جائے۔ امام حسین علیہ السلام کی حیات طیبہ کو چند ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے:

1- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیر سایہ زندگی

2- خلفاء ثلاثہ کا دور حکومت۔ (حضرت علیؑ کا گوشہ نشینی کا زمانہ)

---

*۔ پرنسپل جامعۃ الرضا، بھارہ کہو، اسلام آباد۔

3-حضرت علی علیہ السلام کاظاہری دور خلافت۔

4-امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کادور خلافت وامامت

5-امام حسن علیہ السلام کی شہادت کے بعد معاویہ کی موت تک

6-یزید ملعون کادور حکومت (۶۰-۶۱ ہجری)

کتب تاریخ میں پہلے اورآخری دور کے متعلق کافی مواد موجود ہے لیکن درمیان والے چار ادوار کے بارے میں بہت کم معلومات پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ تاریخی کتابوں کی ورق گردانی کرنے سے کچھ نہ کچھ مواد ضرور مل جاتا ہے جوامام علیہ السلام کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کوروشن کرتا ہے جن سے عام لوگ آگاہ نہیں ہیں۔ اس مختصر مقالے میں ان تمام ادوار کے متعلق بیان نہیں کیاجاسکتا، البتہ امام حسین علیہ السلام کی زندگی کے پانچویں دورپرکچھ گفتگو کی جائے گی جس پر بحث کرنے سے جہاں امام علیہ السلام کی شخصیت سے روشنی ملے گی، وہاں اس سوال کاجواب بھی مل جائے گا کہ امام حسین علیہ السلام نے معاویہ کے دور میں کیوں قیام نہیں فرمایا؟ ۴۱ ھ جمادی الاولی کے وسط میں امام حسن علیہ السلام نے امیر شام سے متعدد شرائط پر صلح کرلی اورحکومت اس کے حوالے کر دی۔ معاویہ نے ان شرائط پرحاضرین کو گواہ بنایا جن میں معروف صحابہ اورتابعین بھی شامل تھے۔ شرائط میں سے کچھ یہ تھیں:

1) حکومت اس شرط پر معاویہ کے حوالے کی جاتی ہے کہ وہ کتاب الٰہی اورسنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اورخلفائے راشدین کی سیرت پر عمل کرے گا۔

2) معاویہ کے بعد حکومت امام حسن علیہ السلام کے پاس ہوگی اوراگران کو کوئی حادثہ پیش آجائے توپھر امام حسین علیہ السلام کے لئے ہوگی اورمعاویہ کسی کو بھی اپنا جانشین یاخلیفہ نہیں بناسکتا۔

3) معاویہ امیرالمؤمنین پرسب وشتم بند کرائے اور علی علیہ السلام کو نیکی کے علاوہ کچھ نہ کہے۔

4) تمام شیعیان علی ابن ابی طالبؑ کوامان ملے گی اور حق کواس کے صاحب تک پہنچایاجائے گا۔ (1)

5) معاویہ اپنے آپ کو امیرالمؤمنین کہلانے کاحق نہیں رکھتا اورنہ ہی امام حسنؑ کے سامنے کوئی شہادت قائم کرسکتاہے۔

اس شرط کے اضافہ کرنے سے امام حسن علیہ السلام نے واضح کردیاکہ وہ معاویہ کورسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کاخلیفہ اورجانشین نہیں مانتے اورنہ ہی اس کی حکومت کو قانونی سمجھتے ہیں۔ جب ان شرائط پر صلح ہوگئی تواس کے

بعد معاویہ نے ان میں سے کسی شرط پر بھی عمل نہیں کیا بلکہ اس کا مقصد صرف اقتدار کو حاصل کرنا تھا جس کا اظہار اس نے ابتدا ہی میں کر دیا۔ امام حسن علیہ السلام سے صلح کرنے کے بعد معاویہ نے کوفہ کا رخ کیا۔ نخیلہ (2) کے مقام پر یا بنابر قول دیگر شہر کوفہ (3) میں اس نے لوگوں سے خطاب کیا اور کہا:

واللہ انی ماقاتلتکم لتصلّوا ولالتصوموا ولا لتحجّوا ولا لتزکّوا، انّکم لتفعلون ذلک، وانما قاتلتکم لأ تأمّر علیکم وقداعطانی اللہ ذلک وانتم لہ کارھون۔۔۔ یعنی: "اللہ کی قسم! میں نے تمہارے ساتھ جنگ اس لئے نہیں کی تھی کہ تم نمازیں پڑھو اور نہ ہی اس لئے کہ تم روزے رکھو اور حج انجام دو۔ اور اس لئے بھی نہیں کہ تم زکوٰۃ ادا کرو۔ تم یہ کام ضرور انجام دوگے۔ میں نے صرف اس لئے جنگ کی ہے کہ میں تم پر حکومت کروں اور یہ حکومت اللہ نے مجھے دی ہے، اگرچہ تم اس سے خوش نہیں ہو۔" اس کے بعد اس نے کہا: "الا وانَّ کُل شئ اعطیت الحسن بن علی تحت قَدَمَّی ھاتین لا افی بہ لہ بشیئ منھا" (4) یعنی: "آگاہ رہو! میں نے حسن بن علیؑ سے جو معاہدہ کیا ہے وہ میرے پاؤں کے نیچے ہے اور میں ان شرائط میں سے کسی پر بھی عمل نہیں کروں گا۔"

چنانچہ معاویہ نے ان شرائط کے برعکس عمل کیا اور آخر کار سن ۵۰ ہجری میں (5) ایک سازش کے تحت جعدہ بن اشعث کے ذریعے امام حسن علیہ السلام کو زہر دلوا کر آپ کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ (6) صلح کی شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ معاویہ کے بعد حکومت امام حسن علیہ السلام کے سپرد ہوگی اور ان کی شہادت کی صورت میں امام حسین علیہ السلام کے حوالے ہوگی نیز معاویہ کوئی حق نہیں رکھتا کہ وہ کسی کو اپنا جانشین مقرر کرے۔ (7)

باقی شرائط کی طرح معاویہ نے اس شرط کی بھی پروا نہ کرتے ہوئے امام حسین علیہ السلام کی موجودگی میں اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین مقرر کر دیا، اس کی ولیعہدی کے لئے تمام علاقوں میں خطوط لکھے اور لوگوں سے بیعت لینا شروع کر دی۔ معاویہ کے دل میں یزید کی ولیعہدی کا خیال کیونکر آیا اور کیسے آیا، یہ الگ بحث ہے جس کی اس مختصر مقالے میں گنجائش نہیں ہے۔

مؤرخین کا کہنا ہے کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد معاویہ نے مصمم ارادہ کرلیا کہ یزید کو ولی عہد مقرر کیا جائے اور اس کے لئے لوگوں سے بیعت لی جائے۔ چنانچہ تمام اسلامی قلمرو کے گورنروں کو مکتوب بھیجے گئے۔ تمام اسلامی مملکت میں مدینہ کی اہمیت سب سے زیادہ تھی اور وہاں امام حسین علیہ السلام

جیسی شخصیت بھی موجود تھی۔ امیر شام نے مدینے کے والی مروان بن حکم کو خط لکھا کہ وہ مدینے کے لوگوں سے یزید کے لئے بیعت لے۔ مروان نے لوگوں کو جمع کیا اور معاویہ کا حکم سنایا۔ لوگوں نے بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ ان انکار کرنے والوں میں امام حسین بن علی علیہ السلام، عبدالرحمٰن بن ابی بکر، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس سرفہرست تھے۔ مروان نے صورتحال سے معاویہ کو آگاہ کیا۔

معاویہ نے مروان کا خط پڑھنے کے بعد سمجھا کہ یہ اس کی کوتاہی ہے۔ لہٰذا اسے معزول کرکے سعید بن العاص کو والی مقرر کر دیا اور اسے خط لکھا کہ تمام مہاجرین وانصار اور ان کی اولادیں جو مدینہ میں موجود ہیں، ان سے سختی کے ساتھ بیعت لی جائے اور کوئی رو رعایت نہ کی جائے۔ البتہ ان چند اشخاص پر دباؤ ضرور ڈالا جائے مگر سختی نہ کی جائے۔ (8) یہ افراد حسین بن علی، عبداللہ بن عمر، عبدالرحمٰن بن ابی بکر، عبداللہ بن زبیر تھے۔ معاویہ کا حکمنامہ ملتے ہی سعید بن عاص نے اہل مدینہ کو بیعت کی دعوت دی مگر سب نے انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک یہ چند اشخاص بیعت کے لئے آمادہ نہیں ہوں گے، ہم بھی بیعت کے لئے تیار نہیں ہیں۔ سعید نے معاویہ کو لکھا کہ اہل مدینہ ان اشخاص کے زیر اثر ہیں اور جب تک یہ بیعت نہیں کریں گے، کتنی بھی کوشش کیوں نہ کی جائے، اہل مدینہ سے بیعت لینا ممکن نہیں۔ اس صورتحال کے پیش نظر معاویہ نے خود مدینہ آنے کا ارادہ کیا۔ اسی سال وہ حج بیت اللہ کے بہانے شامیوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ مدینے پہنچا۔ ان حضرات سے ملاقات پر اظہار ناخوشنودی کیا اور عتاب آمیز گفتگو بھی کی۔ انہوں نے جب یہ رویہ دیکھا تو الگ الگ عمرے کے لئے مکہ روانہ ہوگئے۔ معاویہ نے موسم حج تک مدینہ میں قیام کیا اور اہل مدینہ کو نرم کرنے کے لئے ان پر انعام واکرام کی بارش کر دی۔

اس کے بعد جب امیر شام مکہ پہنچا تو ان حضرات سے بڑے پرتپاک اور احترام سے ملاقات کی اور ہر ایک کا نام اس کی شخصیت کے مناسب لقب کے ساتھ لیا۔ امام حسین علیہ السلام کو سید شباب المسلمین کہا۔ مناسک حج کی بجاآوری کے بعد معاویہ نے ان سب کو ایک جگہ طلب کیا۔ جب یہ افراد معاویہ کے پاس پہنچے تو اس نے شایان شان احترام کیا اور کہا کہ تم نے دیکھا، میں تم پر کس قدر مہربان ہوں۔ تم میرے خون و جگر ہو۔ اس لئے تم سے لطف وعنایت کا برتاؤ کرتا ہوں اب یزید تمہارا بھائی اور ابن عم ہے۔ میں فقط یہ چاہتا ہوں کہ خلافت پہ اس کا نام ہو جائے۔ باقی سب معاملات تمہارے ہاتھ میں رہیں۔ تم جو چاہو گے وہی ہو گا۔ امر و نہی کا سب اختیار تمہیں ہی رہے گا۔ یہ سن کر سب خاموش ہو گئے۔ دراصل سب نے انکار کر دیا۔

اگلے دن معاویہ نے جلسہ عام بلوایا جس میں وہ سب لوگ شریک ہوئے جو اسلامی مملکت کے تمام علاقوں سے حج پر آئے ہوئے تھے۔ مذکورہ افراد کو بھی بلایا اور ہر ایک کے سر پر دو دو مسلح سپاہی تعینات کر دیئے گئے۔ معاویہ منبر پر گیا، خطبہ دیا اور اس کے بعد لوگوں سے یزید کی بیعت کرنے کے لئے کہا اور یہ بھی کہا کہ ان افراد نے اس کی مخالفت نہیں کی ہے اور سب نے یزید کی بیعت کر لی ہے۔ یہ کہہ کر معاویہ منبر سے نیچے اتر آیا اور عام لوگوں نے یزید کی بیعت کرنا شروع کر دی۔ (9)

اس طرح سے معاویہ نے زبردستی اور لوگوں کو دھوکہ دے کر یزید کے لئے بیعت لی۔ ابن قتیبہ نے اس حوالے سے ایک اور واقعہ بیان کیا ہے۔ جب معاویہ مدینے آیا تو اس نے دوسرے دن ابن عباس اور امام حسین علیہ السلام کو بلوایا۔ جب آپ آئے تو اس نے آپ کو اپنی داہنی جانب جگہ دی اور حال احوال پوچھا۔ امام حسین علیہ السلام نے مناسب جواب دیا اور خاموش ہوگئے۔ معاویہ نے گفتگو کا آغاز کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف و توصیف کرنے کے بعد یزید کی بیعت کا معاملہ پیش کیا۔ یزید کو بڑے بڑے القاب سے یاد کیا اور اس کی اچھی اچھی صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے امام حسینؑ کو اس کی بیعت کرنے کے لئے کہا۔ امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

"جو کچھ تو نے یزید کی لیاقت اور امت اسلامی کے امور چلانے کی اہلیت کے بارے میں کہا ہے، وہ اظہر من الشّمس ہے۔ اے معاویہ! تو لوگوں کو یزید کے بارے میں دھوکہ دینا چاہتا ہے۔ گویا کہ تو کسی ایسے شخص کا تعارف کرا رہا ہے جو لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ یا غائب ہو۔ جسے لوگوں نے دیکھا ہی نہ ہو یا اس کو صرف تو ہی جانتا ہو۔ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ یزید نے اپنی شناخت خود کروا دی ہے اور اپنا مافی الضمیر فاش کر دیا ہے۔ یزید کا تعارف کرانا ہے تو یوں کروا کہ یزید کتوں اور کبوتروں سے کھیلنے میں مشغول رہنے والا ہے۔ وہ ایک ابوالہوس آدمی ہے اور اپنا بیشتر وقت راگ رنگ اور رقص و سرور کی محفلوں میں گزارتا ہے۔ یزید کا یہ تعارف کروا اور اس کے علاوہ سعی لاحاصل نہ کر۔ اس امت کے حق میں تو نے جس قدر جرائم کیے ہیں، وہی کافی ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مزید بار گناہ اٹھا کر جانے کی کوشش نہ کر۔ تو نے اس قدر ظلم و انحراف کیا ہے کہ لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ اب تیرے اور تیری موت کے درمیان چند ہی لمحے باقی رہ گئے ہیں..."(10)

اب ہم اس سوال کا جائزہ لیتے ہیں کہ آخر آپ نے معاویہ کی حکومت کے خلاف کیوں قیام نہیں کیا حالانکہ اس نے امام حسن(ع) سے صلح کی کسی شرط پر بھی عمل نہیں کیا؟ اس مختصر مقالے میں شاید ہم ان تمام علل واسباب کا جائزہ نہ لے سکیں۔ البتہ ایک دو باتوں کی طرف اشارہ ضرور کریں گے۔ جب ۴۱ھ میں امام حسنؑ نے معاویہ سے صلح کر لی تو اس کے بعد معاویہ نے نہ صرف صلح کی شرائط پر عمل نہ کیا بلکہ شرائط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عراق کے شیعوں پر عرصہء حیات بھی تنگ کر دیا۔ ان میں سے بہت سے نامور اور صالح ترین افراد جیسے رشید ہجری، عمرو بن حمق خزاعی، جویرہ بن مسہر عبدی، عبد اللہ بن یحییٰ حضرمی اور ان کے ساتھیوں، اسی طرح حجر بن عدی کندی اور ان کے بھائیوں اور ساتھیوں کو قتل کرادیا نیز عراق میں ظلم وستم کا بازار گرم کر دیا تو کوفے کے معززین اور قبائل کے زعماء نے ایک اجتماع منعقد کیا، اموی حکومت کے مظالم اور انحرافات پر بحث و گفتگو کی اور صلح کی شرائط کی عدم پاسداری کو بھی زیر بحث لائے۔

نتیجے کے طور پر انہوں نے زعمائے کوفہ پر مشتمل ایک وفد مدینہ میں امام حسنؑ کی خدمت میں بھیجا تاکہ وہ ان مسائل پر آپؑ سے گفتگو کرے اور آپ کو معاویہ کے خلاف دوبارہ جنگ کرنے پر آمادہ کرے اور معاویہ کی طرف سے صلح کی شرائط کی مکمل خلاف ورزی پر اسے توڑنے پر قائل کریں اور اگر وہ انکار کریں تو پھر وہ یہی مطالبات لے کر امام حسینؑ کے پاس جائیں۔ شاید وہ ان کے مطالبات مان لیں کیونکہ انہوں نے محسوس کیا تھا کہ امام حسینؑ معاویہ کے انحرافات اور ظلم وستم پر سخت ناراض اور غم وغصہ میں ہیں۔

چنانچہ یہ وفد کوفہ سے روانہ ہوا، مدینہ پہنچا اور پروگرام کے مطابق امام حسنؑ کے پاس گیا۔ جب انہوں نے اپنی خواہش کے مطابق جواب نہ پایا تو وہ امام حسینؑ کی خدمت میں آئے تاکہ ان کے ذریعے سے امام حسنؑ کو یا تو معاویہ سے صلح نامہ پر نظر ثانی کے لیے آمادہ کریں یا پھر یہ کہ امام حسینؑ خود قیام کریں۔ امام حسینؑ نے انہیں مندرجہ ذیل جواب دیا:

'قد كان صلح وكانت بيعة كنت لها كارها، فانتظر وامادام هذا الرجل (يعنى معاويه )حياً، فان يهلک نظرنا ونظرتم یعنی: "صلح ہو چکی ہے اور ہمارے لیے مجبوراً بیعت ہے۔ پس تم انتظار کرو، جب تک کہ یہ شخص (یعنی معاویہ) زندہ ہے۔ جب یہ شخص مر جائے تو اس وقت ہم اور آپ دیکھیں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟" (11)

اس جواب کے بعد وہ وفد واپس کوفہ چلا گیا۔ اس کے بعد عراق کے شیعوں اور امام حسینؑ کے درمیان مسلسل رابطہ رہا اور خط وکتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس تمام عرصہ میں آپ (ع) نے انہیں صبر اور انتظار کرنے کی تلقین فرمائی۔ جب ۵۰ھ میں امام حسنؑ کو زہر سے شہید کر دیا گیا تو عراق کے شیعہ دوبارہ متحرک ہو گئے اور انہوں نے امام حسینؑ کو خط لکھا جس میں انہوں نے ان کے بھائی امام حسنؑ کی شہادت پر تعزیت کے ساتھ آپ (ع) کو صلح کا پیمان توڑنے اور معاویہ کے خلاف قیام کرنے کی دعوت دی۔ انہوں نے لکھا:

"ہم تک حسن بن علیؑ کی رحلت کی خبر پہنچی۔ سلام ہو ان پر جس دن وہ پیدا ہوئے، جس دن انہوں نے کوچ کیا اور جس دن وہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے، ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے، انہیں اپنے نبی محمد ﷺ سے ملحق فرمائے، ان کے مصائب پر ان کے اجر میں اضافہ فرمائے، ان کے بعد آپ (ع) کے لیے یہ مصیبت اچھائی میں بدل دے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں حساب وکتاب ہے۔ "انا لله وانا اليه راجعون" اس امت پر اس سے بڑھ کر اور کونسی مصیبت ہو سکتی ہے؟ یہ آپ کے خاص شیعہ ہیں، آپ امیر المومنین (ع) کے فرزند اور رسول خدا ﷺ کی بیٹی کے بیٹے ہیں۔ ہدایت کا علم اور شہروں کا نور ہیں۔ دین کے قائم ہونے کی امید آپ سے ہے۔ صالحین کی سیرت کا اعادہ آپ کے دم سے ہے۔ آپ اس مصیبت پر صبر کریں۔ (اللہ آپ پر رحم فرمائے)۔ کیونکہ صبر کرنا ہی پختہ امور میں سے ہے۔ آپ اپنے سے پہلے والوں کے جانشین ہیں اور اللہ تعالیٰ اسے ہی ہدایت دیتا ہے جو آپ کی راہنمائی میں چلتا ہے۔ ہم آپ کے شیعہ ہیں جو آپ کی مصیبت پر حزن وملال میں ہیں۔ آپ کے غم سے غم واندوہ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ آپ کی خوشی سے خوش ہوتے ہیں۔ آپ کی سیرت پر چلنے والے ہیں۔ آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو شرح صدر دے، آپ کے ذکر کو بلند کرے اور آپ کو اجر عظیم عنایت فرمائے۔ آپ کی مغفرت کرے اور آپ کے حق کو آپ کی طرف واپس پلٹا دے۔ والسلام۔" (12)

امام حسینؑ نے ان کا خط پڑھا اور انہیں جواب میں لکھا:

"مجھے پوری امید ہے کہ صلح کے بارے میں میرے بھائی کی رائے اور ظالموں سے جہاد کے بارے میں میری رائے صحیح اور پختہ اور رشد وہدایت پر مبنی ہے۔ پس فی الحال اپنے آپ کو ظاہر نہ

کرو، زمین سے چمٹے رہو اور ہدایت کا دامن نہ چھوڑو، جب تک یہ ہند کا بیٹا زندہ ہے۔ اگر اسے کوئی حادثہ پیش آگیا اور میں زندہ ہوا تو انشاء اللہ اپنی رائے اور موقف کا اظہار کروں گا۔"(13)

لیکن عراق کے شیعوں خصوصاً اہل کوفہ نے خطوط اور وفود کا سلسلہ جاری رکھا اور آپ بھی انہیں صبر و تحمل اور معاویہ کی موت کے انتظار کا کہتے رہے۔ آخری وفد مسیب بن نخبہ کی سربراہی میں کوفہ سے مدینہ آیا جو معاویہ کے خلاف قیام کا مطالبہ کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے: "ہم آپ کی رائے جانتے ہیں اور آپ سے پہلے آپ کے بھائی کی رائے کو بھی۔" امام حسینؑ نے انہیں جواب دیا: "میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے بھائی کو اس کی نیت کی جزا دے گا اور مجھے ظالموں کے خلاف جہاد سے میری محبت کی نیت کی جزا دے گا۔'' (14) امام حسینؑ کے پاس کوفہ کے وفود اور خطوط کا آنا حکمرانوں سے پوشیدہ نہیں تھا بلکہ حاکم مدینہ مروان بن الحکم نے اس پر معاویہ کو خط بھی لکھا اور اسی کے رد عمل کے طور پر معاویہ نے بھی امام حسینؑ کو مکتوب لکھا اور اپنے عہد و پیمان اور صلح کی پابندی کی تاکید کی۔ معاویہ امام کو لکھتا ہے:

"میرے پاس آپ کی سرگرمیوں کی خبریں پہنچی ہیں۔ اگر یہ خبریں سچ ہیں تو مجھے آپ سے ایسی توقع نہیں تھی اور اگر یہ خبریں غلط ہیں تو بجا ہے، کیونکہ میں ایسی باتوں سے آپ کو بری سمجھتا ہوں۔ جو عہد آپ نے خدا سے کیا ہے، اسے پورا کریں اور مجھے بھی ایسا کرنے پر مجبور نہ کریں۔ اگر آپ میری اور میری حکومت کی تائید نہیں کریں گے تو میں بھی آپ کو جھٹلانے کی کوشش کروں گا اور اگر آپ مجھ سے چال بازی سے پیش آئیں گے تو میں بھی ایسا ہی کروں گا۔ خدا سے ڈریں اور امت اسلامی کو اختلاف اور فتنہ سے بچائیں۔"(15)

امام حسینؑ نے اس جواب میں تحریر فرمایا:

"امّا بعد تمہارا خط ملا۔ تم نے لکھا تھا کہ میرے بارے میں تم تک ایسی خبریں پہنچی ہیں جو تمہارے زعم میں میرے لیے زیب نہیں دیتیں اور تمہارے نزدیک یہ باتیں میرے شایان شان نہیں ہیں۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ نیکی کی ہدایت صرف اللہ ہی دیتا ہے اور وہ باتیں جو میرے بارے میں تم تک پہنچی ہیں، وہ بالکل بے بنیاد ہیں جو سخن چینی کرنے والوں تفرقہ اندازوں اور اختراع پردازوں کی خود ساختہ ہیں۔ نہ میں نے تمہارے خلاف جنگ کرنے کی

تیاری کی ہے اور نہ تمہارے خلاف قیام کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یہ باتیں میں تمہارے خوف اور تم سے عذر خواہی کے ڈر یا تمہارے ظالم، ملحد اور بے دین ساتھیوں کے ڈر کی وجہ سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ خوف خدا کی وجہ سے۔ کیا تم "حجر بن عدی" اور ان کے ساتھیوں جو نمازی اور عبادت گزار تھے، کے قاتل نہیں ہو؟ کہ جن کا گناہ صرف یہی تھا کہ انہوں نے ظلم و بدعت کا مقابلہ کیا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا اور راہ خدا میں کسی کی پرواہ نہ کی۔ اور اس کے باوجود تم نے انہیں ظلم و ستم سے شہید کر دیا جبکہ ان کو امان دی جاچکی تھی اور گزشتہ واقعات کے تحت ان کو اذیت نہ دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود تم نے ان کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے۔ کیا تم رسول ﷺ کے صحابی ''عمرو ابن حمق'' کے قاتل نہیں ہو؟ کیا اس بندہ صالح کو تم نے امان دینے کے بعد قتل نہیں کیا؟ کیا تم وہ شخص نہیں ہو جس نے زیادہ ابن سمیہ کو جو ثقیف کے چند کمینوں کے ہاں پیدا ہوا تھا، اپنا بھائی بنا لیا جب کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ بچہ اپنے باپ کا ہو گا اور زانی کو سنگسار کیا جائے گا۔

تم نے سنت رسول ﷺ کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کی پیروی کی، اللہ کی ہدایت سے انحراف کیا اور اس کے بعد تم نے اس ''زیاد'' کو مسلمانوں پر مسلط بھی کر دیا۔ کیا تم وہ نہیں ہو جس نے اہل ''حضر موت'' کو علی (ع) کے ساتھ محبت کرنے کے جرم میں قتل کر دیا۔ اس وقت جب سمیہ کے بیٹے نے یہ اطلاع دی کہ اہل حضر موت دین علیؑ کے پیروکار ہیں۔ کیا تم نے اسے نہیں لکھا کہ جو شخص علیؑ کے دین کا پیروکار ہو، اسے قتل کر دو۔ سمیہ کے بیٹے نے تیرے حکم پر ان کو قتل کر دیا اور ان کا مثلہ کیا۔ حالانکہ علیؑ کا دین رسول اکرم ﷺ کا دین ہے اور اسی دین کی خاطر علیؑ نے تمہارے بزرگوں کو تہہ تیغ کیا تھا اور اسی دین کے نام سے تم اب حکومت کر رہے ہو۔ معاویہ! تم نے لکھا تھا کہ میں اپنی جان، اپنے دین اور امت محمد ﷺ کا خیال رکھوں اور اس امت میں اختلاف اور فساد نہ کروں۔ میرے نزدیک اس امت پر تیری حکمرانی سے بڑھ کر کوئی مصیبت نہیں ہے۔ جب میں اپنے دین اور امت محمد ﷺ کی خاطر اپنی ذمہ داری کے متعلق سوچتا ہوں تو تم سے لڑنا میرے نزدیک سب سے زیادہ اہم نظر آتا ہے۔

معاویہ ! تم نے لکھا تھا کہ اگر میں نے تمہارے ساتھ کوئی بدی کی تو تم بھی میرے ساتھ بدی کروگے اور اگر میں نے تم سے دشمنی کی تو تم بھی مجھ سے دشمنی کروگے۔ میں آج تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ تم سے جس قدر ممکن ہو سکے، مجھ سے دشمنی کرو۔ مجھے اطمینان ہے کہ تمہاری دشمنی میرے لیے نقصان دہ نہ ہو گی۔ نقصان ہو گا تو تمہیں ہو گا کیونکہ تم جہالت کی سواری پر سوار ہوا اور عہد شکنی کے حریص۔ مجھے اپنی جان کی قسم! کہ تم نے اپنی کسی شرط پر عمل نہیں کیا۔ صلح، صفائی، عہد و میثاق اور امن کے معاہدے کے بعد تم نے کچھ لوگوں کو شہید کر دیا جن کا گناہ صرف یہی تھا کہ وہ ہمارے فضائل کے قائل تھے اور ہماری عظمت بیان کرتے تھے۔ خدا تمہارے ان جرائم کو فراموش نہیں کرے گا اور بے بنیاد الزامات پر ان بندگان صالح کے قتل اور ان کو اپنے گھروں سے نکال کر شہر بدر کر نا ہر گز نہیں بخشے گا۔"[16]

مذکورہ باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام حسینؑ نے اپنے بھائی حسن بن علیؑ کے معاویہ کے ساتھ صلح کے پیمان کی مکمل پاسداری کی ہے۔ جب کہ اس کے برعکس معاویہ نے اس معاہدے کی تمام شرائط کو پس پشت ڈال کر اپنے عزائم اور سازشوں کو جاری رکھا۔ آپ نے معاویہ کی خلاف ورزیوں کی نشاندہی کی اور ان پر اس کی خبر بھی لی۔ اس کی بعض تمناؤں کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بھی بنے اور اپنے موقف کا برملا اظہار بھی کیا۔ جہاں تک معاویہ کے خلاف قیام کا تعلق ہے تو امام اس میں مصلحت نہیں دیکھتے تھے اور اس کے لیے مناسب وقت کے انتظار میں تھے۔ البتہ اپنے قیام کے لیے مسلسل زمین ہموار کرتے رہے۔

اگر امام حسینؑ عہد معاویہ میں قیام فرماتے تو معاویہ امام حسنؑ کی تحریک اور قیام کو بدنام کرنے کے لیے صلح امام حسنؑ سے فائدہ اٹھاتا کیونکہ لوگوں کو پتہ تھا کہ امام حسنؑ نے یہ معاہدہ کیا ہے کہ جب تک معاویہ زندہ ہے، وہ سکوت اختیار کریں گے۔ (17)

البتہ یہ واضح ہے کہ امام حسینؑ اس معاہدہ کو لازم یا واجب الوفاء نہیں جانتے تھے کیونکہ یہ معاہدہ اختیاری نہیں تھا بلکہ مجبوراً کیا گیا تھا۔ خود معاویہ نے صلح کی تمام شرائط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے معاہدہ توڑ دیا تھا اور وہ اس کی حرمت کا قائل ہی نہیں تھا۔ لہٰذا یہ معاہدہ صحیح بھی ہوتا، تب بھی خود معاویہ کی جانب سے اس کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے امام حسین علیہ السلام اس کے پابند نہیں تھے۔

دوسری طرف جس معاشرے میں امام حسینؑ زندگی بسر کر رہے تھے، وہ کسی انقلاب اور قیام کا اہل نہ تھا۔ یہ معاشرہ آرام وسکون کو ترجیح دیتا تھا اور سوچتا تھا کہ چونکہ امام علیہ السلام نے یہ معاہدہ کیا ہے، لہٰذا انہیں اسے پورا کرنا چاہئے اور گمان غالب یہی ہے کہ اگر یہ قیام اس دور میں ہوتا تو سیاسی اور اجتماعی دونوں میدانوں میں کامیاب نہ ہوتا، کیونکہ اس وقت کے لوگ اسے اسی زاویہ سے دیکھتے جو معاویہ نے ان کے لئے تیار کر رکھا تھا اور وہ یہی صلح کا معاہدہ تھا۔ معاویہ رائے عامہ کے سامنے یہی کہتا کہ امام حسینؑ کا قیام غیر قانونی ہے اور یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہے۔ سلیمان بن صرد خزاعی کو امام جو نے جواب دیا تھا، اس کا مطلب یہی ہے۔آپ نے فرمایا:

"جب تک معاویہ زندہ ہے، اس وقت تک ہمارے شیعوں کو چاہئے کہ اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں۔ میں اس مصالحت کے لئے ہر گز راضی نہیں تھا۔ اگر معاویہ مر جاتا ہے تو اس وقت ہم اپنی رائے کا اظہار کریں گے۔ "(18)

جن اسباب و عوامل کی بنا پر امام حسن علیہ السلام نے صلح کی تھی، وہ اسباب اور عوامل اب بھی موجود تھے۔ اگر معاویہ کے خلاف قیام کا کوئی راستہ ہوتا تو امام حسن علیہ السلام ضرور جنگ کرتے اور صلح نہ فرماتے۔ امام حسین علیہ السلام کے سامنے اب بھی وہی مشکلات تھیں۔ مزید یہ کہ صلح کے بعد معاویہ زیادہ طاقتور ہو چکا تھا اور ان حالات میں قیام اور تحریک کی کامیابی یقینی نہ تھی۔ ایسے حالات میں امام حسین علیہ السلام کے لئے اس امر کی ضرورت تھی کہ ہر چیز سے پہلے لوگوں کو قیام کے لئے تیار کریں۔ لہٰذا امام حسینؑ نے اس دور میں اپنے قیام کے لئے افراد کو تیار کیا ہے اور لوگوں کو آگاہی دی ہے جس کا ثبوت منیٰ میں امت کے سر کردہ افراد سے آپ کا خطاب ہے۔

سلیم بن قیس روایت کرتے ہیں کہ معاویہ کی موت سے دو سال قبل امام حسین علیہ السلام حج پر تشریف لے گئے۔ ان کے ہمراہ عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن جعفر بھی تھے۔ امام علیہ السلام نے بنی ہاشم کے مردوں اور عورتوں کو جمع کیا اور انصار میں اپنے ان دوستوں کو اکٹھا کیا جو امام حسین علیہ السلام اور ان کے اہل بیت کو پہچانتے تھے۔ نیز اس سال حج پر آئے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان تمام اصحاب کو، جو عبادت و تقویٰ میں مشہور تھے، بلانے کا حکم دیا۔ اس طرح سے منیٰ میں سات سو سر کردہ افراد جمع ہو گئے جن

میں اصحاب نبی ﷺ کی تعداد دوسو کے قریب تھی۔ زیادہ تر یہ افراد تابعین تھے۔ جب سب لوگ جمع ہوگئے تو آپ کھڑے ہوئے اور خطبہ ارشاد فرمایا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرنے کے بعد فرمایا:

"تم دیکھ رہے ہو کہ اس باغی و سرکش نے ہمارے اور ہمارے شیعوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ اگر میں سچ کہوں تو میری تصدیق کرنا اور اگر غلط کہوں تو میری تکذیب کرنا۔ میں تمہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حق کا واسطہ دیتا ہوں اور اپنی رسول اللہ ﷺ سے قرابتداری کا واسطہ دیتا ہوں کہ جب تم یہاں سے واپس جاؤ تو تم پر لازم ہے کہ میری باتوں کو اپنے اپنے علاقوں میں مورد اعتماد افراد سے بیان انہیں کرو اور انہیں ہمارے حق کے بارے میں جو تم جانتے ہو، دعوت دینا۔ مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں یہ مسئلہ غفلت کا شکار نہ ہو جائے اور حق بالکل غائب اور مغلوب ہی نہ ہو جائے:"والله متم نوره ولوكره الكافرون" (19)

اس کے بعد آپ نے قرآن مجید کی آیات کی تلاوت اور ان کی تفسیر بیان فرمائی اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ آپ کے والد گرامی، والدہ گرامی، برادر ذی وقار اور خود آپ کے اور اہل بیت کے متعلق فرمایا تھا، وہ سب فضائل ایک ایک کرکے بیان کیے۔ جب آپ کوئی حدیث بیان فرماتے تو محفل میں موجود اصحاب تصدیق کرتے اور کہتے: ہاں ہم نے سنا اور دیکھا۔ اسی طرح وہاں موجود تابعین کہتے کہ ہم نے مورد اطمینان اور معتمد اصحاب سے یہ سنا ہے۔ (20)

اس کے بعد آپ نے انہی لوگوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تلقین کی۔ اس روایت سے یہ امر واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اموی حکمرانوں کی طرف سے فضائل اہلبیت پر مشتمل احادیث نبوی ﷺ کو نقل اور بیان کرنے پر سخت پابندی اور قدغن تھی۔ اسی بات نے امام حسین علیہ السلام کو مجبور کیا کہ وہ حج کے موقع پر منیٰ میں ایسا اجتماع منعقد کریں جس میں رسول اللہ ﷺ کے باقی رہ جانے والے اصحاب اور بڑے بڑے تابعین شریک ہوں اور آپ انہیں فضائل اہلبیت یاد دلائیں۔ یوں لگتا ہے کہ آپ انہیں ایک ایسے امر کی یاد دہانی کروا رہے تھے جو بھلا دیا گیا تھا اور شدید دباؤ اور اختناق کی وجہ سے اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اسی لئے آپ نے فرمایا:

"فانی اتخوّف ان یدرس هذا الامر ویذهب الحق ویغلب" یعنی: "مجھے خوف ہے کہ کہیں یہ مسئلہ ختم نہ ہو جائے اور حق جاتا رہے اور مغلوب ہو جائے۔"

معاصر مورخ ڈاکٹر محمد ابراہیم آیتی کے مطابق تحف العقول میں جو خطبہ درج ہے، اس کے فقروں کے دروبست اور طرز خطاب سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اسی موقع کا ہے۔(21) اس بات کو واضح کرنے کے لئے ہم اس خطبے سے کچھ اقتباسات نقل کرتے ہیں: سید الشہداء علیہ السلام نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں آیات الٰہی سنا کر فرمایا: "تم علم، بھلائی اور خیر خواہی کے لئے مشہور ہو۔ لوگوں کے دلوں میں تمہاری عظمت ہے۔ شریف تمہارا احترام کرتے ہیں اور کمزور تمہاری عزت کرتے ہیں۔ جن پر تمہارا کوئی احسان نہیں، وہ بھی تمہیں اپنے سے بہتر اور برتر سمجھتے ہیں۔"

اس کے بعد آپ نے فرمایا:

''تم اللہ تعالیٰ سے بھلائی کے متمنی ہو مگر میں ڈرتا ہوں کہ کہیں غضب الٰہی میں گرفتار نہ ہو جاؤ، کیونکہ تم خدا کے فضل سے ایسے درجے پر ہو جو دوسروں کو حاصل نہیں۔ تمہاری لوگوں میں عزت ہے، لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ خدا سے باندھے ہوئے عہد و پیمان توڑے جا رہے ہیں مگر تمہیں کوئی گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ حالانکہ اگر کوئی تمہارے آباء سے کیے ہوئے عہدوں کی خلاف ورزی کرے تو تم بے چین ہو جاتے ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امانت کو کوئی پوچھتا تک نہیں، بستیوں میں اندھے، گونگے، اپاہج پڑے رہتے ہیں جن پر کوئی ترس نہیں کھاتا۔ تم اپنی ذمہ داریوں کی پروا نہیں کرتے اور جو ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے۔ تم ظلم کو نظرانداز کرکے اور ظالموں سے تعاون کرکے اپنے بچاؤ کی فکر کرتے ہو۔ انہیں انہی باتوں سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا اور دوسروں کو بھی نہی کرنے کا حکم دیا ہے لیکن تم غفلت میں پڑے ہوئے ہو۔ سب سے زیادہ مصیبت تو تمہاری ہی ہے کیونکہ جو مرتبہ تمہیں ملنا چاہئے تھا اور جو مقام علماء کا حق تھا، تم اس سے زبردستی محروم دیئے کر دیئے گئے ہو۔ کاش تم سمجھتے۔''

پھر امام علیہ السلام نے فرمایا:

''دراصل انتظام و انصرام اور اجرائے احکام کا کام علماء کے ہاتھ میں ہونا چاہئے تھا، جو حلال و حرام سے واقف اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کاموں کے نگران ہیں۔ مگر تم سے تمہارا یہ مرتبہ چھین

لیا گیا اور یہ اس لئے ہوا کہ تم حق سے دور ہوگئے، اور واضح دلائل کے باوجود سنت کے بارے میں تم اختلافات کا شکار ہو۔ اگر تم اپنی ذمہ داری محسوس کرتے اور تکالیف و مصائب پر صبر کرتے تو سب اختیارات تمہارے ہی ہاتھ میں ہوتے، لیکن تم نے اپنی جگہ ظالموں کو دے دی اور سب الٰہی امور کا اختیار انہیں سونپ دیا جو مشتبہ طریقوں پر چلتے اور اپنی بیہودہ خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ اس لئے تم پر مسلط ہوگئے کہ تم موت سے بھاگتے تھے اور تمہیں زندگی عزیز تھی، جو ہر حال میں فنا ہونے والی ہے۔ تم نے کمزور اور ضعیف لوگوں کو انہی کے حوالے کر دیا۔ ان میں سے کچھ تو بے چارے بالکل غلام بن کر رہ گئے اور کچھ نان جویں کے محتاج ہو کر رہ گئے۔ اب وہ سارے ملک میں من مانی کرتے ہیں اور اپنی خواہشات پر چل کر رسوائی سمیٹتے ہیں، برے لوگوں کے طور طریقے اپناتے ہیں،ذات جبار کے سامنے حیا نہیں کرتے اور اس کی پروا نہیں کرتے۔ ہر علاقے اور شہر میں ان کا خطیب منبر پر چیختا ہے۔ وہ خدا کی زمین کے بلا شرکت غیرے مالک بنے بیٹھے ہیں۔ کوئی ان کا ہاتھ روکنے والا نہیں اور سب لوگ ان کے زیر دست ہیں۔ وہ جس پر ہاتھ ڈالنا چاہیں، کوئی انہیں روک ٹوک نہیں سکتا۔ان میں کچھ سرکش، ہٹ دھرم اور غریبوں کو ستانے والے ہیں۔ کچھ اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن سے بیگانے ہیں۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ یہ مملکت ایسے ظالموں کے ہاتھ میں ہے جن کا کام صرف لوٹ کھسوٹ ہے اور ایسے لوگ حاکم بنے بیٹھے ہیں جنہیں مومنوں پر رحم نہیں آتا۔ اب ہمارے اور ان کے درمیان اختلاف کا فیصلہ اللہ ہی کرے گا۔ "(22)

یہ خطاب ان لوگوں سے تھا جو عوام میں مقبول اور ممتاز مقام رکھتے تھے اور اس لئے ان کی ذمہ داری بھی دوسروں سے زیادہ تھی مگر وہ اپنے فرائض کی بجاآوری میں کوتاہی کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ امام علیہ السلام نے ظالموں کے اسلامی معاشرے پر تسلط کا ذمہ دار بھی انہی افراد کو ٹھہرایا ہے۔ امام علیہ السلام نے انہیں ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا ہے اب یہ وہی افراد ہو سکتے ہیں جنہیں آپ نے منیٰ میں دعوت دے کر بلایا تھا اور خطاب فرمایا تھا۔ یہ خطاب مدینے میں مہاجرین وانصار سے نہیں ہو سکتا، کیونکہ:
اولاً حاکم مدینہ کی موجودگی میں ایسا اجتماع ممکن نہیں۔

ثانیاً آپ کا اس قسم کی گفتگو کرنا اور حاکم وقت کا معترض نہ ہونا بعید لگتا ہے، اور پھر اس کا ذکر تاریخوں میں بھی نہیں ملتا۔ لہٰذا بعد والے قرائن بھی یہی بتاتے ہیں کہ یہ خطبہ اسی موقعہ پر ارشاد ہوا ہے جس کا ذکر ابتدائے کلام میں ہوا ہے۔ لحن کلام اور خطبے کے مطالب سے ظاہر ہے کہ یہ معاویہ کی وفات کے بعد اور یزید کی بیعت کے معاملہ پیش آنے کے بعد کا نہیں ہے۔اس خطاب سے چند نکات بڑے واضح طور پر سامنے آتے ہیں:

1-امام حسین علیہ السلام حکومت کے حالات پر بڑی گہری نظر رکھے ہوئے ہیں اور اس کے ظالمانہ کردار کے مضمرات سے پوری طرح آگاہ ہیں نیز ان معاملات کو اپنی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسلامی معاشرے کے سرکردہ افراد کو بھی آگاہ کر رہے ہیں اور انہیں موجودہ خطرات سے خبردار کر رہے ہیں۔

2-آپ آئندہ کے حالات کو بصیرت افروز نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں اور پیش آنے والے واقعہ کے لئے لوگوں کو ذہنی طور پر تیار کر رہے ہیں۔

3-آئندہ کے واقعات آئندہ کے قیام کے لئے لوگوں کو آمادہ کرنے کے لئے آپ نے دو چیزوں کو واضح کرنا انتہائی ضروری سمجھا۔ ایک تو اپنا مقام و مرتبہ یاددلایا، اپنی اور اپنے خاندان کی عظمت، فضیلت اور اہمیت کو بیان کیا اور دوسرا موجودہ ظالم حکومت ظلم وجور اور انحرافات کو اجاگر کیا تاکہ لوگ انہیں جن کے خلاف قیام کرنا ہے اور جن کی قیادت میں قیام کرنا ہے، دونوں کو پہچان لیں۔

4-یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ معاویہ کے دور میں امام علیہ السلام خاموش نہیں بیٹھے بلکہ لوگوں کو بیدار کرتے رہے اور امام علیہ السلام اپنے قیام اور انقلاب کے لئے مناسب وقت کی تلاش میں تھے۔اس لئے یہ قطعاً نہیں کہا جاسکتا کہ امام حسین علیہ السلام نے معاویہ کی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا اور وہ صرف یزید کی حکومت کے خلاف تھے۔

☆☆☆☆☆☆

## حوالہ جات

1۔الارشاد للمفید: باب ذکرالامام الحسن بن علی، الفصول المہمہ ابن الصباغ المالکی، ص۱۴۵۔ ذخائر العقبیٰ: ص۱۳۹۔ عمدۃالطالب: ص۵۲۔

2۔ایضاً

3۔تاریخ یعقوبی، ج۲، ص۱۹۲۔

4۔ایضاً

5۔انساب الاشرف، بلاذری، ج۳، طبع بیروت۔

6۔ مقتل الحسین، محمد تقی بحرالعلوم، ص۸۱، بیروت۔

7۔شرح نہج البلاغہ، ج۴، ص۸۔

8۔تاریخ عاشورہ، ابراہیم آیتی، ص۲۴۔

9۔الامامۃ والسیاسۃ، ج۱، ص۱۸۳تا۱۸۲۔

10۔الامۃ والسیاسۃ، ج۱، ص۱۹۵۔۱۹۶

11۔انساب الاشراف، ج۳

12۔تاریخ یعقوبی، ج۲، ص۲۰۳۔

13۔ مقتل الحسین، ۸۰تا۸۸۔

14۔ بلاذری کی انساب الاشراف، ج۳، ص۱۵۲، مطبوعہ بیروت۔

15۔انساب الاشراف، ج۲، ص۵۳۔

16 ۔الشیخ الطبرسی، الاحتجاج، ج2، تحقیق السید محمد باقرالخرسان، النجف الاشرف، دار النعمان للطباعۃ والنشر، 1386 - 1966م، ص۲۱۔

17۔شرح ابن حدید، ج۴، ص۸۔

18۔امامۃ والسیاسۃ، ج1، ص173۔

19۔الامام الحسین فی مدنیۃ المنورہ ورحلتہ الی مکۃ المکرمۃ، ج۱، ص۲۵۸۔

20۔الامام حسین فی المدینہ منورہ، ص۲۵۸۔

21۔تاریخ عاشورہ، ص۲۹۔

22۔تحف العقول، ص۲۳۷تا۲۳۹۔

# کربلا میں صحابہء رسول ﷺ کا کردار

# The Role of the Companions of Holy Prophet(PBUH) in Karbala

حجۃ الاسلام سید ثمر علی نقوی*

## مقدمہ

حضرت امام حسین علیہ السلام کا انقلاب پوری امت اسلامیہ کی نجات، توحید کی سربلندی اور انسانیت کی آزادی کا پیغام لے کر آیا تھا لیکن صد افسوس کہ اس انقلاب سے پوری امت اسلامیہ نے وہ فائدہ حاصل نہ کیا جس کے امام حسین علیہ السلام خواہشمند تھے۔اس کی ایک وجہ دشمن کی جانب سے اس مقدس انقلاب کے خلاف مذموم الزام تراشیاں ہیں جن کے ذریعے مقاصد واہداف امام حسین کو غلط رنگ دے کر سادہ لوح مسلمانوں کو اس نور الٰہی سے دور رکھنے کی ناجائز کوشش کی گئی۔بنی امیہ کے حامیوں اور ظالم حکومتوں کے آلہء کار افراد نے انقلاب حسین پر غیر آئینی اقدام کا الزام لگاتے ہوئے کہا کہ اس کی نوعیت خلیفۃ المسلمین کے خلاف بغاوت اور لشکر کشی کی ہے۔ چنانچہ "شوکانی" نقل کرتے ہیں:

> "کچھ علماء حد سے گذر گئے اور وہ فرزند رسول ﷺ حضرت امام حسینؑ کے اقدام کو شرابی، نشے باز اور حرمت شریعت مطہرہ کی ہتک کرنے والے یزید بن معاویہ (ان پر خدا کی لعنت ہو) کے خلاف بغاوت سمجھتے ہیں۔"(1)

اس الزام کا ایک جواب یہ ہے کہ یہ بات سلف صالح کی روش کے متضاد ہے۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ اس وقت کے علماء، صحابہ، تابعین اور سیاست دان سب اس بات پر متفق تھے کہ حضرت امام حسینؑ حق پر ہیں۔ انہوں نے یزید کے اس غیر انسانی اقدام کی مذمت کی اور کسی نے بھی حضرت امام حسین علیہ السلام کے اقدام کو خلیفہ المسلمین کے خلاف بغاوت نہیں سمجھا۔ چنانچہ مولانا مودودی لکھتے ہیں:

---

*۔ نور الہدیٰ مرکز تبلیغات، اسلام آباد۔

"اگرچہ ان (حسینؑ) کی زندگی میں اور حتیٰ کہ ان کے بعد بھی صحابہ وتابعین میں سے کسی ایک شخص کا بھی یہ قول ہمیں نہیں ملتا کہ آپ کا خروج ناجائز تھا اور وہ ایک فعل حرام کا ارتکاب کرنے جارہے تھے۔" (2)

ہم ثابت کریں گے کہ صحابہ وتابعین کا مخالفت کرنا تو کجا، کثیر تعداد میں صحابہ کرام اور تابعین نے انقلاب حسین کی حمایت کرتے ہوئے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ بعض مادہ پرست لوگوں نے اس واقعہ کو دو خاندانوں کی جنگ قرار دینے کی مذموم کوشش کی اور بعض افراد نے امام حسینؑ کے مقصد کو ''حکومت طلبی'' سے تعبیر کیا۔ ان اعتراضات کے جواب مدلل انداز میں مفصل کتب میں پیش کئے گئے ہیں۔ اس مقالہ میں کوشش کی گئی ہے کہ ان پاکیزہ اذہان پر، جنہیں جنہیں ''حقائق'' کی تلاش رہتی ہے۔ ایک خاص زاویہ سے انقلاب امام حسینؑ کے مقدس ہونے اور یزید کی اسلام دشمنی کو واضح کیا جائے۔

امام حسین علیہ السلام ایک فرد نہیں تھے جنہوں نے یزید بن معاویہ کی باطل حکومت کے خلاف قیام کیا، بلکہ آپ اس مقدس تحریک کے عظیم راہبر تھے جو اس وقت کی باطل ،اسلام دشمنی اور ناجائز حکومت کے خلاف وجود میں آئی۔ امام حسینؑ کو پیغمبر اسلام ﷺ نے ''ہدایت کا چراغ'' قرار دیا تھا: (انّ الحسین مصباح الھدی وسفینۃ النجاۃ) اس وقت جب امت گمراہی کی تاریکیوں میں ڈوب رہی تھی، امام حسینؑ ہادی وراہنما بن کر ایسی تحریک کا آغاز کرتے ہیں جس کا ہر اسلام کے خواہشمند، غیرت منداور رسول اللہ ﷺ سے عقیدت و محبت رکھنے والے شخص نے ساتھ دیا۔

ہاں البتہ اس تحریک کی حمایت کرنے والوں کی نوعیت مختلف تھی۔ بعض نے زبانی کلامی حمایت کی اور بعض افراد، جن میں اصحاب رسول ﷺ کی ایک خاص تعداد تھی، نے اپنی جان کی بازی لگا کر اس انقلاب کو پائیدار کرنے میں مدد کی۔ امید ہے یہ مقالہ ''حق'' کے ہر متلاشی، مخصوصاً ان افراد کے لئے جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے خاص عقیدت و محبت رکھتے ہیں، بہترین راہنما ثابت ہو گا۔ اس لئے کہ امام حسینؑ کی پیروی میں صحابہ کرام کی کثیر تعداد نے قربانیاں پیش کی ہیں۔ بعض اصحاب کربلا میں پہنچ کر علی الاعلان یزید کے باطل نظریات کے خلاف جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ بعض کربلا سے قبل کوفہ یا دیگر مقامات پر امام حسین علیہ السلام کی حمایت کے جرم میں یزیدی کارندوں کے ہاتھوں شہید کر دیئے گئے۔ نیز بعض اصحاب جو کچھ وجوہات کی بناپر واقعہ کربلا میں شریک نہ ہوسکے تھے، امام حسین کی

شہادت کے بعد یزید کے مظالم کے خلاف اور امام حسینؑ کی حمایت میں قیام کرتے ہیں اور جانیں قربان کرکے ثابت کرتے ہیں کہ اس راہ میں موت، شہادت و سعادت کی موت ہے۔

اس تحریر میں صرف ان اصحاب رسول اللہ ﷺ کے احوال و واقعات کو درج کیا گیا ہے جو کربلا میں نواسہء رسول اللہ ﷺ کی حمایت کرتے ہوئے شہادت کے مقام پر فائز ہوئے۔ شہدائے کربلا میں اصحاب پیغمبر ﷺ کو مختلف معتبر منابع سے ذکر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نیز بعض اُن صحابہ کرام کے اسمائے گرامی درج کرنے سے اجتناب کیا گیا ہے جو معتبر کتب میں درج نہ تھے۔ یہ بات بھی بیان کرنا ضروری ہے کہ ''صحابی'' کی تعریف میں اختلاف نظر کو مد نظر رکھتے ہوئے اس نظریہ کے مطابق اصحاب کو درج کیا گیا ہے جو صحابیِ رسول ﷺ کے مفہوم میں وسعت کا قائل ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کے حامی افراد میں ہم صرف ابن حجر عسقلانی کی عبارت کو نقل کرتے ہیں:

"واصحُّ ما وقفت علیه من ذالک انّ الصحابی من لقی النبی صلی الله علیه وآله وسلم موموناً به ومات علی الاسلام[3] یعنی: " صحیح ترین تعریف یہ ہے کہ حالت ایمان میں پیغمبر ﷺ کی زیارت کرنے والے اور اسلام کی حالت پر فوت ہونے والے کو صحابی کہتے ہیں۔"

اس تعریف کے مطابق ہر وہ شخص صحابی ہوگا جو طولانی مدت یا کم مدت پیغمبر ﷺ کی صحبت میں رہا، جنگ میں شریک ہوا یا نہ، باقاعدہ زیارت کی یا کسی مجبوری (جیسے نابینا ہونے) کی وجہ سے زیارت سے محروم رہا..." اسی تعریف کے مطابق شہداء کربلا صحابہ میں بعض ایسے افراد کو بھی ذکر کیا گیا ہے جو ''صحابہ ادراکی'' ہیں، یعنی زیادہ مدت پیغمبر ﷺ کی خدمت میں موجود نہ تھے۔ اگرچہ بعض صحابہ ایسے بھی ہیں جو رسول اللہ ﷺ کا ساتھ دے کر شہادت کی آرزو تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

## 1-اسلم بن کثیر الازدی (یا مسلم بن کثیر)

زیارت ناحیہ میں ان کا نام ''اسلم'' ذکر ہوا ہے جبکہ کتب رجال میں بجائے ''اسلم'' کے ''مسلم بن کثیر الازدی الاعرج'' بیان ہوا ہے۔ زیارت ناحیہ کے جملات یوں ہیں:"السلام علیٰ اسلم بن کثیر الازدی الاعرج......[4]" مرحوم زنجانی نے نقل کرتے ہیں کہ یہ صحابیِ رسول ﷺ تھے۔ (5) مرحوم شیخ طوسی اور مامقانی اپنی کتب رجال میں نقل کرتے ہیں کہ جنگ جمل میں تیر لگنے سے ان کا پاؤں زخمی

ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ''اعرج'' (ایک پاؤں سے اپاہج) ہو گئے۔ انہوں نے صحبت پیغمبر اسلام ﷺ کو درک کیا تھا۔ عسقلانی لکھتے ہیں:" مسلم بن کثیر بن قلیب الصدفی الازدی الاعرج...الکوفی له ادراک للنبی ﷺ ''مزید اضافہ کرتے ہیں۔ فتح مصر میں بھی یہ صحابی رسول ﷺ حاضر تھے۔ طبری اور ابن شہر آشوب نے ان کاذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کربلا میں حملہ ٔ اولیٰ میں شہید ہوئے۔(6)

مسلم بن کثیر ''ازد'' قبیلہ کے فرد تھے۔ جب امام حسین علیہ السلام نے مدینہ سے ہجرت کی تو ان دنوں یہ صحابی رسول ﷺ کوفہ میں قیام پذیر تھے۔ یہی وجہ ہے امام حسین علیہ السلام کو کوفہ میں آنے کی دعوت دینے والوں میں یہ شامل ہیں۔ پھر حضرت مسلم بن عقیل جب کوفہ میں سفیر حسین بن کر پہنچے تو انہوں نے حضرت مسلم بن عقیل کی حمایت کی لیکن حضرت مسلم کی شہادت کے بعد کوفہ کو ترک کیا اور کربلا کے نزدیک حضرت امام حسین علیہ السلام سے جا ملے اور پہلے حملہ میں جام شہادت نوش کیا۔(7)

حضرت رسول اکرم ﷺ نے اپنے اس صحابی کے متعلق جو ایک جنگ میں ''اعرج'' ہونے کے باوجود شریک ہوئے اور اپنی جان کی قربانی پیش کی، فرمایا:"والذی نفسی بیده لقد رأیت عمروبن الجموح یطأُ فی الجنه بعرجته......"یعنی مجھے قسم ہے اس ذات کی، جس کے قبضہ ٔ قدرت میں میری جان ہے، میں دیکھ رہا ہوں عمرو بن الجموح کو، کہ لنگڑا ہو کر بھی جنت میں ٹہل رہا ہے۔" اس بنا پر حضرت مسلم بن کثیر کا بھی وہی مقام ہے کہ اگرچہ قرآن فرماتا ہے: لَیۡسَ عَلَی الۡاَعۡمٰی حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الۡاَعۡرَجِ (8) یعنی جہاد میں شرکت نہ کرنے میں اندھے پر کوئی حرج نہیں اور نہ ہی لنگڑے پر کوئی مؤاخذہ ہے۔ لیکن اس فداکار اسلام نے نواسہ ٔ رسول ﷺ کی حمایت میں اپنی اس اپاہج حالت کے باوجود جان قربان کر کے ثابت کیا کہ اسلام کے تحفظ کے لئے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے ''صاحب تنقیح المقال'' کے یہ جملے ہیں: ''شہید الطف غنی عن التوثیق'' فرماتے ہیں: "چونکہ یہ کربلا کے شہداء میں شامل ہیں، لہٰذا وثاقت کی بحث سے بے نیاز ہیں۔"

## 2-انس بن حارث:

حضرت پیغمبر ﷺ کے صحابی تھے۔ جنگ بدر و حنین میں شرکت بھی کی۔(9) مرحوم مامقانی فرماتے

ہیں: ''(انس)بن حارث صحابی نال بالطف الشهادة ''(10)(صحابیء رسول ﷺ تھے اور کربلا میں شہادت کے مقام پر فائز ہوئے)۔ ابن عبدالبر اپنی کتاب الاستیعاب میں یوں رقمطراز ہیں:
"انس بن حارث روىٰ عنه والد اشعث بن سليم عن النبیﷺ فی قتل الحسين وقتل مع الحسين رضی الله عنهما"(11) یعنی: "انس بن حارث کے واسطہ سے اشعث بن سلیم کے والد نے نبی اکرم ﷺ سے امام حسینؑ کی شہادت سے متعلق روایت نقل کی ہے کہ یہ (انس بن حارث) حضرت حسینؑ کے ہمراہ شہید ہوئے۔"

الاستیعاب نے جس روایت کا ذکر کیا ہے وہ یوں ہے کہ حضرت انس بن حارث نے رسول خدا(ص) سے سنا تھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرا بیٹا (حسینؑ) کربلا کی سرزمین پر قتل کیا جائے گا۔ جو شخص اس وقت زندہ ہو، اس کے لئے ضروری ہے کہ میرے بیٹے کی مدد و نصرت کو پہنچے۔'' راوی کہتا ہے کہ انس بن حارث نے پیغمبر ﷺ کے اس فرمان پر لبیک کہتے ہوئے کربلا میں شرکت کی اور امام حسینؑ کے قدموں پر اپنی جان نچھاور کر دی۔(12) اس حدیث نبوی ﷺ کی اہمیت کے پیش نظر ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اسے کامل سند کے ساتھ ذکر کر دیا جائے:

"سعد(سعيد)بن عبدالملك بن واقد الحرانی بن عطا بن مسلم الخقاف عن اشعث بن سليم عن ابيه قال سمعت انس بن حارث يقول:سمعت رسول اللهﷺ يقول:ان ابنی هذا(يعنی الحسين)يُقتل بارض يقال لها كربلا فمن شهد منكم فلينصره۔" قال(العسقلانی):"فخرج انس بن الحرث الى كربلا فقتل مع الحسين۔"

صاحب فرسان نے ابن عساکر سے یوں نقل کیا ہے :"وقال ابن عساكر انس بن الحرث كان صحابياً كبيرا ممن رأى النبیﷺ وسمع حديثه وذكره عبدالرحمٰن السلمی فی اصحاب الصفه......"(13) ابن عساکر لکھتے ہیں کہ انس بن الحرث ان عظیم اصحاب رسول ﷺ میں سے تھے جنہیں حضرت پیغمبر ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ انہوں نے آپ ﷺ سے حدیث بھی سنی تھی۔ عبدالرحمٰن سلمی نے انہیں اصحاب صفہ میں شمار کیا ہے''...

حضرت انسؓ کا ذکر تمام معتبر منابع میں مختلف عناوین سے موجود ہے۔ مثلاً انس بن حارث کاہلی(14) انس بن ابی سحیم(15) مکمل ترجمہ یہ ہے: ''انس بن حارث بن نبیہ بن کاہل بن عمرو بن مصعب بن اسد بن

حزیمہ اسدی کاہلی'' واقعہ کربلا کے دوران کوفہ میں زندگی بسر کر رہے تھے یا بعض کے بقول مکہ میں مقیم تھے۔ جب انہیں حضرت امام حسینؑ کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ عراق میں وارد ہو چکے ہیں تو رات (16) کے وقت اپنی اقامت گاہ سے نکل پڑے اور عاشقانہ انداز میں اپنے مولا امام حسینؑ سے جا ملے۔

بلاذری لکھتے ہیں کہ حضرت انسؓ کوفہ سے نکل پڑے۔ ایک مقام پر امام حسینؑ اور عبیداللہ بن حر جعفی کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی۔ فوراً امام حسینؑ کی خدمت حاضر ہوئے اور قسم کھانے کے بعد عرض کی ''کوفہ سے نکلتے وقت میری نیت یہ تھی کہ عبیداللہ بن حر کی طرح کسی کا ساتھ نہ دونگا (نہ امام کا نہ دشمن کا) یعنی جنگ سے اجتناب کرونگا لیکن خداوند نے میری مدد فرمائی کہ آپ کی مدد و نصرت کرنے (کے خیال) کو میرے دل میں ڈال دیا اور مجھے جرأت نصیب فرمائی تاکہ اس حق کے راستے میں آپ کا ساتھ دوں۔'' حضرت امام حسین علیہ السلام نے انہیں ہدایت اور سلامتی ایمان کی نوید سنائی اور انہیں اپنے ساتھ لے لیا۔ (17)

یہ صحابی، نواسۂ رسول ﷺ کے دشمنوں سے جنگ کرنے کی غرض سے کربلا میں موجود تھے۔ حضرت امام حسینؑ نے اپنے اس وفادار ساتھی کو یہ ذمہ داری سونپی کہ عمر بن سعد کو حضرت کا پیغام پہنچائے اور اس ملعون کو نصیحت کرے کہ شاید وہ ہوش میں آجائے اور قتل حسین (ع) سے باز رہے۔ جب حضرت انسؓ، عمر بن سعد کے پاس پہنچے تو اس کو سلام نہ کیا۔ عمر بن سعد نے اعتراض کیا کہ تو نے مجھے سلام کیوں نہیں کیا، آیا تو مجھے کافر اور منکر خدا سمجھتا ہے؟ حضرت انسؓ نے فرمایا: ''تو کیسے منکر خدا اور سول ﷺ نہ ہو جبکہ تو فرزند رسول ﷺ کے خون بہانے کا عزم کر چکا ہے'' یہ جملہ سن کر عمر بن سعد سر نیچے کرلیتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ میں بھی جانتا ہوں کہ اس گروہ (گروہ حسین (ع)) کا قاتل جہنم میں جائے گا، لیکن عبیداللہ بن زیاد کے حکم کی اطاعت ضروری ہے۔ (18)

ابتدائے ملاقات سے حضرت انس تکلیف دہ حالات کو اپنی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ لہٰذا جب دشمن کی طرف سے جنگ شروع ہوئی تو حضرت انس بھی دیگر اصحاب حسین علیہ السلام کی طرح حضرت امام سے اجازت طلب کرکے عازم میدان ہوئے۔ یہ مجاہد جوان نہیں تھا گو ایمان جوان تھا۔ نقل ہے کہ حضرت انسؓ کی حالت یہ تھی کہ سن پیری (بڑھاپے) کی وجہ سے خمیدہ (جھکی ہوئی) کمر کو شال (رومال) سے باندھ کر سیدھا کرتے ہیں۔ ان کے سفید ابرو آنکھوں پر پڑ رہے تھے چنانچہ وہ رومال پیشانی پر باندھ کر اپنی

آنکھوں سے ان بالوں کو ہٹاتے ہیں اور میدان کارزار میں روانہ ہوتے ہیں۔ حضرت امام حسینؑ نے جب اپنے اس بوڑھے صحابی کو دیکھا تو حضرت کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور فرمایا: ''خدا تجھ سے یہ قربانی قبول کرے، اے پیر مرد۔'' (19)

ہر مجاہد جنگ کرتے وقت رجز (مجاہدانہ اشعار) پڑھا کرتا تھا۔ جو رجز حضرت انسؓ نے پڑھا ہے، نہایت پر معنی تھا۔ پہلے اپنا تعارف کرایا۔ پھر کہا": واستقلبوا لقوم بغرٍ الآن آل علی شیعة الرحمٰن، وآل حرب شیعة الشیطان" (20) یعنی: "کاہل ونسب دان جانتے ہیں کہ میرا قبیلہ دشمن کو نابود کرنے والا ہے۔ اے میری قوم۔ شیر غراں کی طرح دشمن کے مقابلے میں جنگ کرو کیونکہ آل علی رحمان کے پیروکار جبکہ آل حرب (بنوسفیان) شیطان کے پیروکار ہیں۔" بہر صورت، انہوں نے بڑھاپے کے باوجود سخت جنگ کی۔ ۱۲ یا ۱۸ دشمنوں کو قتل کرنے کے بعد جام شہادت نوش کیا۔ زیارت ناحیہ کے جملے یہ ہیں: "السلام علی انس بن الکاهل الاسدی" (21)

## 3-بکر بن حی:

علامہ سماوی نے اپنی کتاب ابصار العین میں حدائق الوردیہ سے نقل کیا ہے کہ ''بکر بن حی'' کوفہ سے عمر بن سعد کے لشکر میں شامل ہو کر کربلا پہنچے لیکن جب جنگ شروع ہونے لگی تو حضرت امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عمر بن سعد کے خلاف جنگ کرتے ہوئے پہلے حملے میں شہید ہوگئے۔ منتہیٰ الآمال میں ان کا ذکر ان شہداء میں موجود ہے جو حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے۔(22) تنقیح المقال نے ''بکر بن حی'' کو شہدائے کربلا میں شمار کیا ہے۔ عبارت یوں ہے: "بکر بن حی من شهدا الطف بحکم الوثاقة" ابن حجر عسقلانی نے ''بکر بن حی'' کے ترجمہ میں لکھا ہے: "بکر بن حی بن علی تمیم بن ثعلبه بن شهاب بن لام الطائی......له ادراک ولولده مسعود ذکر بالکوفه فی زمان الحجاج وکان فارساً شجاعاً......" (23) (بکر بن حی...نے حضرت پیغمبر ﷺ کے حضور مبارک کو پایا اور ان کے بیٹے مسعود کے بارے میں ملتا ہے کہ وہ حجاج بن یوسف کے زمانے میں کوفہ میں مقیم تھے۔) الاصابہ میں ''بکر بن حی'' کے صحابی رسول ﷺ ہونے کی گواہی ملتی ہے۔ گو یہ بیان نہیں کیا گیا کہ

یہ صحابی کربلا میں شہید ہوئے یا نہیں؟لیکن دیگر منابع رجال ومقاتل میں انہیں شہدائے کربلا میں شمار کیاگیاہے۔

## 4-جابر بن عروہ غفاری:

کتاب''شہدائے کربلا''میں بیان ہوا ہے کہ متاخرین کے نزدیک یہ صحابی رسول خدا ﷺ تھے جو کربلا میں شہید ہوئے۔جنگ بدر اور دیگر غزوات میں رسول اکرم ﷺ کے ہمراہ شریک ہوئے۔یہ بوڑھے صحابی روز عاشورا رومال باندھ کر اپنے ابروؤں کو آنکھوں سے ہٹاتے ہیں اور عازم میدان جنگ ہوتے ہیں۔جب امام علیہ السلام کی نظر پڑی تو فرمایا:اے پیر مرد!خدا تجھے اجر دے۔''(24) ذبیح اللہ محلاتی نے مقتل خوارزمی سے درج ذیل عبارت نقل کی ہے:"ثم یرز جابر بن عروۃ الغفاری وکان شیخاً کبیراً وقد شهد مع رسول الله بدراً او حنیناً وجعل یشد وسطه بعمامعته ثم شدحاجبیه بعصابته حتی رفعهما عن عینیه والحسین ینظر الیه وهویقول شکرالله سعیک یاشیخ فحمل فلم یزل یقاتل حتی قتل ستین رجلاً ثم استشهد رضی الله عنه"(25)

بعض کتب جیسے تنقیح المقال، مقتل ابی مخنف اور وسیلۃ الدارین میں صحابی رسول ﷺ اور شہید کربلا کے عنوان سے ان کا تذکرہ بیان ہوا ہے۔البتہ دیگر معتبر منابع میں ان کا ذکر موجود نہیں۔اس وجہ سے بعض محققین ان کے بارے میں متردد ہیں۔''تنقیح''کے جملے یہ ہیں ''جابر بن عمیر الانصاری،صحانی مجہول ''(26) جبکہ وسیلۃ الدارین کی عبارت کے مطابق یہ صحابی رسول ﷺ تھے اور جنگ بدر کے علاوہ دیگر جنگوں میں بھی شریک رہے:"انّ جابر بن عروہ کان اصحاب رسول اللهﷺ یوم بدر وغیرها..."(27)جب دشمن کے مقابلہ میں آئے تو یہ رجز پڑھا:

قد علمت حقاً بنوغفار　　　وخندف ثم بنو نزار
ینصرنا لاحمدمختار　　　یاقوم حاموا عن بنی الاطہار
الطیبین السادۃ الاخیار　　　صلی علیهم خالق الابرار

''یہ بنوغفار وخندف نزار قبائل جانتے ہیں کہ ہم یاور محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔اے لوگو! آل اطہار، جو سید و سردار ہیں،ان کی حمایت کرو کیونکہ خالق ابرار نے بھی ان پر درود وسلام بھیجا ہے۔''

ان الفاظ کے ساتھ دشمن پر آخری حجت تمام کرتے ہوئے چندافراد کو واصل جہنم کرنے کے بعد جام شہادت نوش کیا۔(28)

**5-جنادۃ بن کعب الانصاری:**

جنادہ بن کعب وہ صحابی رسول ﷺ ہیں جو حضرت امام حسینؑ کی نصرت کے لئے کربلا میں اپنی زوجہ اور کم سن فرزند کے ساتھ شریک ہوئے اور خود کو اپنے بیٹے سمیت نواسہء رسول ﷺ کے قدموں پر قربان کر دیا۔ علامہ رسولی محلاتی نقل کرتے ہیں: جنادہ صحابی رسول خدا ﷺ اور حضرت علی علیہ السلام کے مخلص شیعہ تھے۔ جنگ صفین میں حضرت علیؑ کے ساتھ شریک ہوئے۔(29) وہ کوفہ میں حضرت مسلم بن عقیل کے لئے بیعت لینے والوں میں شامل تھے۔ بعد ازاں حالات خراب ہونے کی وجہ سے کوفہ کو ترک کیا اور امام حسینؑ سے جا ملے۔

تنقیح المقال نے جنادہ کے تذکرہ کو اس طرح بیان کیا ہے:"جنادة بن (كعب)بن الحرث السلماني الازدي الانصاري الخزرجي من شهداء الطف...وقدذكراهل السير انه كان من اصحاب رسول الله ﷺ ......"(30)

صاحب کتاب فرسان نے تاریخ ابن عساکر کے حوالے سے نقل کیا ہے: ابن مسعود روایت کرتے ہیں'' حضرت پیغمبر اکرم ﷺ نے جنادۃ بن الحارث کو ایک مکتوب میں بیان فرمایا کہ یہ مکتوب محمد رسول اللہ ﷺ کی جانب سے جنادہ اور اس کی قوم نیز ہر اس شخص کے لئے ہے جو اس کی پیروی کرے گا، کہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کریں۔ جو اس حکم پر عمل کرے گا، وہ خدا اور رسول ﷺ کی حفظ وامان میں رہے گا۔''(31) اس فداکار صحابی رسول ﷺ نے اپنے رہبر کے حکم پر عمل کرکے نہ فقط مال کی زکوٰۃ ادا کی بلکہ اپنی جان اور اولاد کی زکوٰۃ بھی دیتے ہوئے دنیا و آخرت کی سعادت حاصل کر لی۔ حضرت جنادہ کی زوجہ ''مسعود خزرجی'' کی بیٹی اور بڑی شجاع و فداکار خاتون تھیں۔ جب جنادہ شہید ہو چکے تو اس مجاہدہ خاتون نے اپنے خوردسال بیٹے عمرو بن جنادہ کو (جو گیارہ یا نوسال (32) کی عمر میں تھا)، حکم دیا کہ جاؤ جہاد کرو۔ یہ با ادب بچہ ماں کی اجازت کے باوجود اپنے مولا و آقا حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں آیا اور بڑے احترام سے عرض کی: "مجھے جہاد کی اجازت

عطافرمائیں۔" حضرت (ع) نے یہ کہہ کر اجازت دینے سے انکار کیا کہ شاید تیری ماں راضی نہ ہو (کیونکہ تیرا سن چھوٹا ہے اور تیری ماں بوڑھی ہے)۔ یہ جملے سننا تھے کہ اس ننھے مجاہد نے عرض کی کہ ''انّ امّی قدامرتنی" (میری ماں تو مجھے اجازت دے چکی ہیں)۔ " میری ماں نے نہ فقط اجازت دی ہے بلکہ مجھے لباس جنگ اس نے خود پہنایا ہے اور حکم دیا ہے آپ پر جان قربان کر دوں۔" امام حسینؑ نے جب اس کا جذبہء جہاد دیکھا تو اجازت دے دی۔ میدان جنگ میں آ کر صحابی رسول ﷺ کے اس کمسن فرزند نے اپنا تعارف بڑے نرالے انداز میں کرایا۔ خلاف معمول اپنا نام یا والد اور قبیلے کا ذکر نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کمسن بچے کے بارے میں مؤرخین میں اختلاف ہے کہ یہ کس کا فرزند ہے۔ بعض کتب میں یہ جملہ ملتا ہے کہ "خرج شباب قتل ابوہ فی المعرکہ"(33)۔ پس وہ دشمن کو للکار کر کہتا ہے:

امیری حسین ونعم الامیر		سرور فواد البشیرالنذیر
علی وفاطمه والداه		فهل تعلمون له من نظیر
له طلعة مثل شمس الضحیٰ		له غُرّہ مثل بدر المنیر (34)

''میرے آقا و سردار اور بہترین سردار حسین ہیں۔ بشیر النذیر (پیغمبر اکرم ﷺ) کے دل کا چین ہیں۔ علی و فاطمہ علیہما السلام جس کے والدین ہوں، کیا اس کی مثال (دنیا میں) کہیں مل سکتی ہے؟ وہ چمکتے سورج کی مانند نور افشانی کرنے والے اور چودھویں کے چاند کی مانند (تاریکیوں میں) روشنی دینے والے راہنما امام ہیں۔''

میدان جنگ میں شہید ہو جانے کے بعد دشمن نے سر جدا کر کے ماں کی طرف پھینکا۔ ماں نے سر اٹھا کر کہا: ''مرحبا'اے نور عین''۔ اور پھر دشمن کو دے مارا اور عمود خیمہ اٹھا کر دشمن کی فوج پر حملہ کرنا چاہا لیکن حضرت امام حسینؑ نے واپس بلالیا اور اس باوفا خاتون کے حق میں دعا فرمائی۔ حضرت جنادہ کا نام بعض منابع میں ''جابر''(35) یا ''جبار'' یا ''جیاد'' درج ہوا ہے ان کے والد کے نام کو بھی بعض نے ''حارث''(36) اور بعض نے ''حرث''(37) ذکر کیا ہے جبکہ قاموس(38) میں ''جنادہ'' کے نام سے تذکرہ موجود ہے۔ ان کے قبیلہ کا نام ''سلمانی''(39) یا ''سلمانی ازدی''(40) بیان ہوا ہے۔ یہ صحابی رسول ﷺ ''عذیت الھجانات'' کے مقام پر امام حسینؑ کے حضور شرفیاب ہوئے۔ اسی

دوران ''حر'' امام حسینؑ کا راستہ روک کر انہیں گرفتار کرنا چاہتا تھا جبکہ امام کی شدید مخالفت کی وجہ سے وہ اس کام سے باز رہا۔ امام علیہ السلام ان تازہ شامل ہونے والے افراد (جیسے جنادہ بن حارث) کے ذریعے کوفہ کے حالات سے مطلع ہوئے۔ وہ اس وقت سے لے کر روز عاشور تک امام کے ساتھ رہے۔ صبح عاشور جنادہ بعض دیگر افراد کے ساتھ تلوار ہاتھ میں لے کر دشمن کے لشکر پر حملہ آور ہوئے۔ دشمن کے نرغہ میں گھر جانے کی وجہ سے یہ تمام افراد ایک مقام پر درجہء شہادت پر فائز ہوئے۔(41) زیارت رجبیہ و ناحیہ میں ان پر ''سلام'' ذکر ہوا ہے۔

## 6-جندب بن حجیر الخولانی الکوفی:

''جندب بن حجیر کندی خولانی'' یا ''جندب بن حجر'' (42) پیغمبر اکرم ﷺ کے عظیم صحابی اور اہل کوفہ میں سے تھے۔ یہ ان افراد میں سے ہیں جنہیں حضرت عثمان نے کوفہ سے شام بھیجا تھا۔ جنگ صفین میں بھی شرکت کی، حضرت علی علیہ السلام کی طرف سے قبیلہ ''کندہ اور ازد'' کے لشکر کے سپہ سالار مقرر ہوئے اور واقعہ کربلا میں امام حسینؑ کے ہمرکاب جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔(43)

صاحب وسیلۃ الدارین لکھتے ہیں: "قال ابن عساکر فی تاریخه هوجندب بن حجیر بن جندب بن زهیر بن الحارث بن کثیر بن جثم بن حجیر الکندی الخولانی الکوفی یقال له صحبة مع رسول الله وهو من اهل الکوفه وشهد مع النبیﷺ......وقال علماء السیر ومنهم الطبری:

انه قاتل جندب بن حجیر بین یدیه الحسین حتی قتل فی اول القتال......"(44)

مندرجہ بالا کے ترجمہ کے مطابق یہ صحابی رسول ﷺ اور شہدائے کربلا میں سے تھے۔

جندب بن حجیر کے صحابی رسول ﷺ ہونے میں اتفاق ہے لیکن مقام شہادت میں اختلاف ہے۔ ابن عساکر انہیں جنگ صفین کے شہداء میں ذکر کرتے ہیں (45) لیکن بعض دیگر معتبر منابع انہیں شہدائے کربلا میں شمار کرتے ہیں۔ تنقیح المقال میں ان کا تذکرہ اس طرح ہے:

..."شهد الطف...وعده الشیخ من رجاله من اصحاب الحسین واقول هو جندب بن حجیر الکندی الخولانی الکوفی وذکر اهل السیر انّ له صحبة و..."(46)

نیز رجال طوسی، ''اقبال'' اور ''اعیان الشیعہ'' میں بھی انہیں شہدائے کربلا کی فہرست میں ذکر کیا گیا ہے۔(47)

جندب کوفہ کے نامدار اور معروف شیعہ افراد سے تعلق رکھتے تھے۔ کوفہ کے حالات خراب ہونے کی وجہ سے وہاں سے نکل پڑے۔ عراق میں حر کا لشکر پہنچنے سے قبل حضرت امام حسینؑ سے مقام ''حاجر'' میں ملاقات کی اور امام کے ہمراہ وارد کربلا ہوئے۔ جب روز عاشور (عمر سعد کی طرف سے) جنگ شروع ہوئی تو یہ دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے پہلے حملہ میں مقام شہادت پر فائز ہوئے۔(48)

**7-حبیب بن مظاہر الاسدی:**

یہ خاندان بنی اسد کے معروف فرد، حضرت رسول اکرم ﷺ کے صحابی اور امام علی، امام حسن و امام حسین علیہم السلام کے وفادار ساتھی تھے۔ (49)عسقلانی ان کا تذکرہ بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:
"حبیب بن مظاہر بن رئاب بن الاشتر...الاسدی کان صحابیاً له ادراک وعمرحتی قتل مع الحسین یوم الطف مع ابن عمه ربیة بن خوط بن رئاب مکنی اباثور"(50)

معتبر منابع میں ان کے حالات زندگی اور کربلا میں جہاد کا ذکر مفصل ملتا ہے حبیب بن مظاہر حضرت علی علیہ السلام کے شاگرد خاص اور وفادار صحابی تھے۔ اپنے مولا علیؑ کے ساتھ کئی جنگوں میں شرکت کی۔ آپ کو بہت سے علوم پر دسترس تھی۔ زہد و تقویٰ کے مالک تھے۔ ان کا شمار پارسایان شب اور شیر ان روز میں ہوتا ہے۔ ہر شب ختم قرآن کرتے تھے۔(51)

صاحب رجال کشی (اختیار معرفۃ الرجال)، فضیل بن زبیر کے حوالہ سے حضرت حبیب بن مظاہرؓ اور میثم تمارؓ کے مابین ہونے والے مکالمے کو نقل کرتے ہیں جس میں یہ دونوں حضرات اپنی شہادت سے متعلق پیش آنے والے حالات سے ایک دوسرے کو آگاہ کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے یہ تربیت شدہ شاگرد ''علم باطن'' اور ''علم بلایا ومنایا''(آئندہ آنے والی مشکلات ومصائب) پر کس قدر تسلط رکھتے تھے۔ تفصیلی مکالمہ ملاحظہ ہو۔ ''رجال کشی ص۷۸''

حضرت حبیب بن مظاہرؓ کا شمار راویان حدیث میں بھی ہوتا ہے۔ روایت میں ہے کہ حبیب ایک مرتبہ امام حسین(ع) سے سوال کرتے ہیں کہ آپ حضرات قبل از خلقت آدم(ع) کس صورت میں تھے؟ حضرت امام حسین(ع) نے فرمایا: ''ہم نور کی مانند تھے اور عرش الٰہی کے گرد طواف کررہے تھے اور فرشتوں کو تسبیح و تمجید و تہلیل سکھاتے تھے۔(52)

حضرت حبیبؓ ان افراد میں شامل تھے جنہوں نے سب سے پہلے امام حسینؑ کو کوفہ آنے کی دعوت دی۔(53) پھر جب حضرت مسلم بن عقیلؑ کوفہ پہنچے تو سب سے پہلا شخص جس نے حضرت مسلمؑ کی حمایت اور وفاداری کا اعلان کیا، عابس بن ابی شبیب شاکری تھے۔ اس کے بعد حبیب بن مظاہر کھڑے ہوئے اور عابس شاکری کی بات کی تائید کرتے ہوئے یوں گویا ہوئے: ''خدا تم پر رحم کرے کہ تم نے بہترین انداز میں مختصر الفاظ کے ساتھ اپنے دل کا حال بیان کر دیا۔ خدا کی قسم؛ میں بھی اسی نظریہ پر پختہ یقین رکھتا ہوں جسے عابس نے بیان کیا ہے۔(54)

چنانچہ حبیب، حضرت مسلمؑ کے بہترین حامی تھے اور مسلم بن عوسجہؓ کے ساتھ مل کر حضرت مسلم بن عقیلؑ کے لئے لوگوں سے بیعت لیتے تھے (55) لیکن جناب مسلم بن عقیل (ع) کی شہادت کے بعد اہل کوفہ کی بے وفائی کی وجہ سے ان کے قبیلہ والوں نے مجبوراً ان دونوں (حبیب اور مسلم بن عوسجہ) کو مخفی مقام پر منتقل کر دیا لیکن جونہی حبیب بن مظاہر کو امام حسین علیہ السلام کے کربلا پہنچنے کی خبر ملی تو وہ رات کے وقت سے فائدہ اٹھا کر حضرت سے جا ملے۔ ان کی حالت یہ تھی کہ دن کو مخفی رہتے اور رات کو سفر کرتے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنی دلی آرزو کو پا لیا۔(56) اگرچہ بعض منابع نے ذکر کیا ہے کہ حضرت امام حسینؑ کو جب جناب مسلم بن عقیل کی شہادت کی خبر ملی تو آپ نے حبیب بن مظاہر کو خط لکھ کر بلایا۔(57) لیکن یہ مطلب معتبر ذرائع کی رو سے ثابت نہیں۔(58)

کربلا پہنچنے کے بعد جب انہوں نے عمر سعد کے لشکر میں اضافہ ہوتا دیکھا تو امام سے اجازت لے کر اپنے قبیلے ''بنی اسد'' کے پاس گئے اور مفصل خطاب کے بعد ان سے امام حسینؑ کی مدد و نصرت کے لئے درخواست کی، جس کا خلاصہ ملاحظہ فرمایئے: ''... میں تمہارے لئے بہترین تحفہ لایا ہوں اور وہ یہ کہ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ فرزند رسول ﷺ کی مدد کے لئے تیار ہو جاؤ... نواسہء رسول ﷺ آج عمر سعد کے بائیس ہزار کے لشکر کے محاصرہ میں ہیں۔ تم لوگ میرے ہم قبیلہ ہو لہٰذا میری بات پر توجہ دو تاکہ دنیا و آخرت کی سعادت تمہیں نصیب ہو سکے۔ خدا کی قسم! تم میں سے جو بھی فرزند رسول خدا ﷺ کے قدموں میں جان قربان کرے گا، وہ مقام اعلیٰ علیین پر حضرت رسول خدا ﷺ کے ساتھ محشور ہوگا۔"(59) حضرت حبیب ابن مظاہر کی تقریر اتنی موثر تھی کہ بہت سے لوگوں نے اس آواز پر لبیک کہا اور حضرت امام حسین علیہ السلام کا ساتھ دینے کے لئے آمادہ و تیار ہوگئے لیکن ''ارزق بن

حرب صیدادی'' ملعون نے چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ ان افراد پر حملہ کر کے انہیں انہیں منتشر کر دیا۔ حبیب نے یہ اطلاع حضرت امام حسین (ع) کو پہنچائی۔ جب حضرت امام حسینؑ نے اپنے خدا سے راز و نیاز کرنے کے لئے عصر تاسوعا (نہم محرم) کو دشمن سے مہلت طلب کی تو اس دوران ''حبیب'' نے لشکر عمر سعد کو موعظہ و نصیحت کرتے ہوئے کہا: ''خدا کی قسم! وہ کتنی بری قوم ہو گی کہ جب کل روز قیامت اپنے پیغمبر ﷺ کے حضور حاضر ہو گی تو ایسے حال میں کہ اس کے ہاتھ اسی رسول ﷺ کے نواسے اور ان کے یار و انصار کے خون سے آلودہ ہوں گے۔''

آپ کا شہادت کی موت سے محبت کا یہ عالم تھا کہ جب شب عاشور اپنے ساتھی ''یزید بن حصین'' سے مزاح کرتے ہیں تو یزید بن حصین نے کہا کہ یہ کیسا وقت ہے مزاح کا؟ جبکہ ہم دشمن کے محاصرے میں ہیں اور موت کے منہ میں جانے والے ہیں۔ تو حبیب نے کہا: اے دوست! اس سے بہتر کونسا خوشی کا وقت ہو گا جبکہ ہم بہت جلد اپنے دشمن کے ہاتھوں شہید ہو کر بہشت میں پہنچنے والے ہیں۔(60)

ایک روایت کے مطابق شب عاشور جب ہلال بن نافع نے حبیب بن مظاہر کو بتایا کہ حضرت زینب سلام اللہ علیہا پریشان ہیں کہ میرے بھائی حسینؑ کے صحابی کہیں بے وفائی نہ کر جائیں تو آپ تمام اصحاب کو جمع کر کے در خیمہ پر لائے اور حضرت زینبؑ کی خدمت میں صمیم دل سے اظہار وفاداری کیا اور اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کا دوبارہ عہد کیا تاکہ حضرت زینبؑ کی یہ پریشانی ختم ہو سکے۔(61)

صبح روز عاشور حضرت امام حسینؑ نے اپنے لشکر کو منظّم کیا۔ دائیں طرف موجود لشکر کی کمانڈ زہیر بن قین اور بائیں طرف حبیب بن مظاہر جبکہ قلب لشکر کی سربراہی حضرت ابوالفضل العباسؑ کے سپرد کی۔ اسی اثناء میں دشمن کے سپاہی وارد میدان ہو کر مبارزہ طلبی کرتے ہیں تو حبیب مقابلہ کے لئے آمادہ ہو گئے لیکن حضرت امام (ع) نے روک لیا۔ اسی طرح ظہر عاشور جب امام (ع) نے لشکر عمر سعد سے نماز ادا کرنے کی خاطر جنگ بندی کے لئے کہا تو ایک ملعون نے گستاخی کرتے ہوئے کہا کہ تمہاری نماز قبول نہیں ہو گی۔ (نعوذ باللہ) اس وقت حضرت حبیب سے برداشت نہ ہوا اور وہ فوراً یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے ''اے حمار (گدھے)! تیرے خیال باطل میں آل پیغمبر ﷺ کی نماز قبول نہیں؟ اور تمہاری نماز قبول ہے؟ ''اس طرح ان دونوں کا مقابلہ ہوا۔ حبیب نے اس ملعون کو زمین پر گرا دیا۔ پھر باقاعدہ رجز پڑھتے ہوئے وارد میدان ہوئے۔ شدید جنگ کی۔ دشمن کے کئی افراد کو واصل جہنم کیا لیکن ایک تیمی

شخص نے تلوار کا وار کیا جس کی تاب نہ لا کر آپ شہید ہو گئے اور اس نے آپ کے سر کو تن سے جدا کر لیا۔ اسی سر کو بعد میں گھوڑے کی گردن میں باندھ کر کوفہ میں پھرایا گیا۔ گویا کوفہ کا نامور مجاہد اہل کوفہ سے یہ کہہ رہا تھا کہ دیکھو؛ یہ سر آل رسول ﷺ کی خاطر کٹ سکتا ہے لیکن دشمن کے سامنے جھک نہیں سکتا۔ (62) السلام علیک یاحبیب بن مظاهرالاسدی

## 8-زاہر بن عمرو الاسلمی:

زاہر بن عمرو الاسلمی ایک شجاع اور بہادر شخص تھے۔ صحابی رسول ﷺ اور اصحاب شجرہ میں سے تھے۔ محبین اہل بیت علیہم السلام میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ یہ حضرت رسول خدا ﷺ کے ہمراہ غزوہ حدیبیہ اور جنگ خیبر میں شریک ہوئے۔ ذبیح اللہ محلاتی وسیلۃ الدارین کی عبارت نقل کرتے ہیں: "قال العسقلانی فی الاصابه هوزاهر بن عمرو بن الاسود بن حجاج بن قیس الاسدی الکندی من اصحاب الشجرة وسکن الکوفه وروی عن النبیﷺ وشهدالحدیبیه وخیبر......"(63) یعنی: "زاہر در حقیقت زاہر بن عمرو... الکندی ہیں جو اصحاب شجرہ میں سے تھے۔ یہ کوفہ میں مقیم تھے اور انہوں نے حضرت رسول خدا ﷺ سے روایت بھی نقل کی ہے۔ نیز حدیبیہ اور خیبر میں شریک تھے۔"

ان کے بیٹے "مجزأۃ" نے اپنے والد کے واسطہ سے پیغمبر اکرم ﷺ سے روایت بیان کی ہے۔ فوق الذکر بات مختصر فرق کے ساتھ دیگر منابع میں بھی موجود ہے (64) لیکن بعض محققین کے خیال میں زاہر اور زاہر اسلمی دو الگ الگ افراد ہیں۔ (65) البتہ تنقیح کی عبارت میں انہیں اصحاب شجرہ اور شہدائے کربلا میں شمار کیا گیا ہے۔ "زاہر اسلمی والد مجزأۃ من اصحاب الشجرہ" نیز فرماتے ہیں: "زاهر صاحب عمرو بن الحمق شهید الطف فوق الوثاقه وعده الشیخ فی رجاله من اصحاب ابی عبدالله واقول هوزاهر بن عمروالاسلمی الکندی من اصحاب الشجره روی عن النبیﷺ وشهد الحدیبیه وخیبر وکان من اصحاب عمربن الحمق الخزاعی کمانص علی ذالک اهل السیرو..."(66)

مذکورہ بالا عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ "زاہر" نام کے دو اشخاص ہیں لیکن مرحوم مامقانی کی نظر میں زاہر بن عمرو اسلمی کا شمار اصحاب شجرہ اور شہدائے کربلا میں ہونا ثابت ہے۔ نیز وہ بیان کرتے ہیں کہ یہ

محب اہل بیت تھے۔ بہت بڑے تجربہ کار پہلوان اور بہادر شخص تھے۔وہ امام علیؑ کی شہادت کے بعد ''عمر بن حمق''کے ساتھ مل کر معاویہ کی ظالمانہ حکومت اور ابن زیاد کے خلاف بر سر پیکار رہے۔ جب معاویہ نے ان کی گرفتاری اور قتل کا حکم صادر کیا تو یہ دونوں شہر سے فرار کر گئے اور پہاڑوں اور جنگلوں میں زندگی بسر کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ''عمرو بن حمق'' کو حکومتی کارندوں کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد شہید کر دیا گیا لیکن زاہر زندہ رہے۔آخرکار ۶۰ھ میں حج کے موقع پر امام حسینؑ کی خدمت میں شرفیاب ہوئے اور آپ کے ساتھ مل کر کربلا کی جنگ میں شرکت کی۔ انہوں نے عاشورا کے دن پہلے حملے میں جام شہادت نوش کیا۔(67)زیارت ناحیہ اور رجبیہ میں ان پر سلام ان الفاظ میں ذکر ہوا

السلام علی زاھر مولیٰ عمرو بن حمق(68)

## 9-زیاد بن عریب ابو عمرو:

قدیم محققین نے ان سے متعلق کوئی نکتہ بیان نہیں کیا لیکن بعض معاصرین نے ان کا تذکرہ اس طرح درج کیا ہے:"زیاد بن عریب بن حنظله بن دارم بن عبدالله بن کعب الصائدبن همدان"(69)ابو عمرو زیاد بن عریب نے حضرت پیغمبر ﷺ کے حضور مبارک کو پایا۔ ان کے والد بزرگوار بھی صحابی رسول تھے۔ ابو عمرو شجاع، عابد و زاہد اور شب زندہ دار شخص تھے۔ بہت زیادہ نماز گزار تھے۔ زہد و تقویٰ کی وجہ سے غیرت دینی نے انہیں آرام سے نہ بیٹھنے دیا۔ لہٰذا واقعہ کربلا میں اپنا کردار ادا کرنے کی غرض سے حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں پہنچے اور دشمن کے خلاف جہاد و مبارزہ کرنے کے بعد درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔(70)

## 10-سعد بن الحارث مولی امیر المومنین:

یہ بزرگوار سعد بن حرث خزاعی کے نام سے معروف ہیں۔ قدیم منابع میں ان کا نام شہدائے کربلا کی فہرست میں ذکر نہیں لیکن بعض متاخرین نے شہید کربلا کے عنوان سے ان کے حالات زندگی قلمبند کیے ہیں۔ سعد بن حرث خزاعی نے صحبت پیغمبر اکرم ﷺ کو حاصل کیا۔ چنانچہ اس لحاظ سے وہ صحابی رسول ﷺ ہیں۔ پھر امیر المومنین کے ہمراہ رہے۔ حضرت نے انہیں کچھ عرصہ کے لئے سپاہ کوفہ کی سربراہی سونپی تھی۔ نیز کچھ مدت کے لئے انہیں آذر بائیجان کا گورنر بھی مقرر کیا۔ صاحب فرسان نے ''

حدایق الوردیہ''، ''ابصار العین''، ''تنقیح المقال'' اور ''الاصابہ'' جیسی معتبر کتب سے ان کے حالات نقل کیے ہیں۔(71) نیز الاصابہ سے سعد کا تذکرہ کچھ یوں نقل کیا ہے لیکن الاصابہ میں رجوع کرنے سے یہ تذکرہ نہیں ملا: "سعید بدل سعد بن الحارث بن شاربه بن مرة بن عمران بن رياح بن سالم بن غاضر بن حبشه بن كنجب الخزاعی مولیٰ علی بن ابی طالب له ادارک وکان علی شرطة علی فی الکوفه و ولاة آذربایجان ......"(72)

کتاب وسیلۃ الدارین نے بھی ص ۱۲۸ پر صحابی اور شہید کربلا کے عنوان سے ان کا ذکر کیا ہے۔ تنقیح المقال کی عبارت میں بھی اس طرح موجود ہے":سعد بن الحارث الخزاعی مولیٰ امیر المومنین صحابی امامی شهید الطف ثقه"مزید لکھتے ہیں کہ سعد بن الحارث له ادراک الصحبة النبیﷺ وکان علی شرطة امیر المؤمنین فی الکوفه وولاة آذربائیجان(73) مزید تفصیلات ان کتب میں موجود نہیں، البتہ اتنا ضرور ملتا ہے کہ '' سعد '' امیر المومنین کی شہادت کے بعد حضرت امام حسنؑ و امام حسینؑ کے ہر میدان میں یار و مددگار رہے۔ جب حضرت امام حسینؑ نے قیام کیا تو ابتداء میں اپنے مولا کے ساتھ مکہ میں جا ملے۔ پھر مکہ سے کربلا آئے اور روز عاشور جنگ کرتے ہوئے جان قربان کر دی۔(74)

اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ '' مرحوم محقق شوشتری'' نے اپنی کتاب میں ان کے صحابی ہونے پر تنقید کی ہے، اور وہ اس دلیل کی بنا پر کہ اگر وہ صحابی ہوتے تو قدیم منابع نے کیوں ان کا ذکر نہیں کیا؟(75) لیکن مذکورہ بالا بعض معتبر منابع میں ان کا ذکر صحابی رسول ﷺ ہونے کے عنوان سے آجانا ہمارے مدعا کے اثبات کے لئے کافی ہے۔

## 11-شبیب بن عبداللہ مولیٰ الحرث:

''شبیب بن عبداللہ بن شکل بن حی بن جدیہ۔'' یہ حضرت رسول اکرم ﷺ کے صحابی اور کوفہ کی معروف و مشہور شخصیت اور بڑے بافضیلت انسان تھے۔(76) انہوں نے جہاں بھی ظلم و ستم دیکھا، اس کے خاتمہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ جمل و صفین و نہروان میں بھی شرکت کی اور حضرت علیؑ کے وفادار یار و مددگار رہے(77) مختلف معتبر منابع میں ان کا ذکر موجود ہے جیسے '' رجال طوسی''، '' استر آبادی''، '' تنقیح''، '' مقتل ابی مخنف''، '' تاریخ طبری'' وغیرہ۔ ''تنقیح'' میں

ان کا تعارف اس طرح درج ہے":شبیب بن عبدالله مولی الحرث صحابی شہیدالطف،فوق الوثاقه '' شبیب، سیف بن حارث اور مالک بن عبداللہ کے ہمراہ کربلا پہنچے اور اپنے مولا امام حسین (ع) کی اطاعت میں جنگ کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔کتاب روضۃ الشھداء ص۲۹۵ میں ان پر سلام نقل ہوا ہے: السلام علی شبیب بن عبدالله مولیٰ بن سریع

## 12- شوذب بن عبداللہ الہمدانی الشاکری:

جناب شوذب، صحابی رسول ﷺ اور حضرت علیؑ کے باوفا ساتھی تھے۔ مرحوم'' زنجانی'' نے علامہ'' مامقانی'' سے ان کا تذکرہ نقل کیا ہے :"ذکر العلامه مامقانی فی رجاله شوذب بن عبدالله الهمدانی الشاکری ان بعض من لایحصل له ترجمه تخیل انّه شوذب مولی عابس والحال ان مقامه اجل من عابس من حیث العلم والتقویٰ وکان شوذب صحابیاً واشترک مع امیر المؤمنین ..."(78)

شوذب علم و تقویٰ کے اعتبار سے بلند پایہ شخصیت تھے۔ کوفہ کی معروف علمی شخصیت ہونے کی وجہ سے اہل کوفہ کے لئے حضرت امیر المومنینؑ کی احادیث نقل کرتے تھے۔ امام علیؑ کے ساتھ تینوں جنگوں میں شریک رہے۔جب حضرت مسلم بن عقیلؑ کوفہ پہنچے تو شوذب ان کی بیعت کرنے کے بعد حضرت امام حسینؑ تک اہل کوفہ کے مزید خطوط پہنچانے میں عابس شاکری کے ہمراہ رہے۔ نہایت مخلص اور عابد و زاہد انسان تھے۔ آپ نے بڑھاپے کے عالم میں بھی ظلم کے خلاف عملی کردار ادا کیا۔ کوفہ میں حضرت مسلمؑ کی شہادت کے بعد عابس شاکری کے ہمراہ حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں کربلا پہنچے۔ جب حنظلہ بن سعد شبامی شہید ہوگئے تو عابس نے شوذب سے پوچھا کہ کیا خیال ہے؟ کہنے لگے: تمہارے ہمراہ فرزند رسول خدا ﷺ کی نصرت کے لئے جنگ کرنا چاہتا ہوں تاکہ شہادت کا مقام حاصل کر سکوں۔ عابس نے کہا: "اگر یہ ارادہ ہے تو امام کے پاس جا کر اجازت طلب کرو۔" انہوں نے امامؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر اجازت جہاد حاصل کی اور وارد جنگ ہوئے۔ چند دشمنوں کو واصل جہنم کیا۔آخر میں شہید ہوگئے۔ (79) زیارت رجبیہ اور زیارت ناحیہ میں ان پر ان الفاظ میں سلام بھیجا گیا ہے: السلام علی شوذب مولی شاکر (80)

قابل توجہ امر یہ ہے کہ بعض افراد یہ خیال کرتے ہیں کہ ''شوذب''، ''عابس شاکر'' کے غلام تھے جبکہ اہل علم حضرات سے پوشیدہ نہیں کہ لفظ مولی صرف غلام کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ ''ہم پیمان'' کے معنی بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض محققین نے لکھا ہے کہ چونکہ شوذب مقام علمی و معنوی کے اعتبار سے عابس پر برتری رکھتے تھے، لہٰذا انہیں غلام عابس نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ عابس اور اس کے قبیلہ کے ہم پیمان و ہم عہد تھے۔(81) یہی دلیل علامہ مامقانی سے نقل شدہ تذکرے میں بیان کی گئی ہے۔

## 13-عبدالرحمٰن الارحبی:

یہ بزرگوار حضرت رسول اکرم ﷺ کے بزرگ صحابی تھے۔ تمام معتبر منابع میں ان کا ذکر موجود ہے جیسے "رجال شیخ طوسی"، "رجال استرآبادی"، "مامقانی"، نیز "الاستیعاب"، "الاصابہ" اور "وسیلۃ الدارین" نے بھی ان کے متعلق نقل کیا ہے۔ تاریخ طبری اور الفتوح میں ان کے بعض واقعات بھی بیان ہوئے ہیں۔ "الاستیعاب" کی عبارت اس طرح ہے:"...هو عبد الرحمن بن عبدالله بن الكدن الارحبی......"انه كان من اصحاب النبیﷺ له هجرة...

معاویہ بن ابی سفیان کی وفات کی خبر جب کوفہ پہنچی تو کچھ لوگ "سلیمان بن صرد خزاعی" کے گھر جمع ہوئے تاکہ اجتماعی طور پر حضرت امام حسینؑ کو خط لکھ کر دعوت دیں اور خلافت کو ان کے سپرد کریں۔ نیز کوفہ کے گورنر نعمان بن بشیر کو کوفہ سے باہر نکال دیں۔ ان خطوط کو ''قیس بن مسہر صیداوی''، عبد الرحمٰن ارحبی اور عمارۃ بن عبداللہ السلولی لے کر حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس طرح یہ دوسرا گروہ تھا جو حضرت کو دعوت دینے کے لئے آیا، کیونکہ پہلا گروہ عبداللہ بن سمیع کی قیادت میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

عبدالرحمٰن ارحبی شجاع، تجربہ کار، فاضل اور فصیح و بلیغ صحابی تھے۔ (82) ۵۰ھ یا ۵۳ھ (83) دو دعوت نامے لے کر ۱۲رمضان المبارک ۶۰ھ کو مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ عبدالرحمٰن ارحبی ۱۵۰ افراد پر مشتمل ایک وفد کے ہمراہ حضرت امام حسینؑ کی خدمت اقدس میں پہنچے۔(84) مکہ میں حضرت امامؑ کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ پھر حضرت کے نمائندہ خاص جناب امیر مسلمؑ کے لئے کوفہ میں انقلابی سرگرمیوں میں مشغول رہے۔ کوفہ میں حالات خراب ہونے کے بعد کربلا میں دشمنان دین کے خلاف جنگ میں شرکت کی۔ جب عمر بن سعد نے امام حسینؑ کے قتل کا پختہ

ارادہ کر لیا تو اس صحابی رسول ﷺ نے اپنی جان کی بازی لگا کر بھی اپنے مولا و آقا کی حمایت کا اعلان کیا۔ اپنی شجاعت کے کارنامے دکھانے کے علاوہ فصاحت و بلاغت کے ذریعے بھی حسین ابن علیؑ کی حقانیت اور بنو امیہ کے بطلان کو اپنے اشعار میں واضح کیا۔

تاریخ میں اس وفادار صحابی کے جو رجز بیان ہوئے ہیں، وہ اس زمانے کے حالات کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ کیونکہ بنو امیہ نے اسلام کے نام پر اسلام کی نابودی کا تہیہ کر رکھا تھا، اس لئے وہ صحابہء کرام جو پیغمبر اکرم ﷺ کے قول و فعل کے ذریعے اسلام کے حقیقی راہبر کی شناخت کر چکے تھے، اب دشمنان دین کو اسلام کے حقیقی راہبر کی اطاعت وفرمانبرداری کی طرف دعوت دینا اپنا اولین فریضہ سمجھتے تھے۔ عبدالرحمٰن کے رجز کا ایک مصرعہ یوں ہے:

انی لمن ینکرنی ابن الکدن　　　　انی علی دین حسین وحسن(85)

اسی طرح امام حسینؑ کو ''دین حق'' کا علمبردار سمجھتے ہوئے ان کے قدموں میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ اس شہید باوفا پر زیارت ناحیہ میں ان الفاظ میں سلام پیش کیا گیا ہے: السلام علی عبدالرحمٰن بن عبدالله بن کدرالارحبی(86)

## 14-عبدالرحمٰن بن عبد ربہ الخزرجی:

مختلف منابع نے اس شخصیت کے لئے صحابی رسول ﷺ ہونے کی گواہی دی ہے۔ انہیں بعض ماخذات نے انصاری بھی لکھا ہے۔ یہ اصل میں مدینہ میں مقیم تھے۔ جب پیغمبر اسلام ﷺ نے مدینہ کی جانب ہجرت فرمائی تو اوس و خزرج قبائل نے اسلام قبول کیا۔ اس وقت سے ان سب کو انصاری کہا جاتا تھا۔ صاحب قاموس الرجال نقل کرتے ہیں کہ "عبدالرحمٰن بن عبدربہ الانصاری الخزرجی کان صحابیاً له ترجمة وروية وکان من مخلص اصحاب امیرالمؤمنین علیه السلام"(عبدالرحمٰن صحابی رسول ﷺ تھے جن سے روایت بھی نقل ہوئی ہے اور وہ حضرت امیر علیہ السلام کے مخلص اصحاب میں سے تھے۔)

جس روایت کے ذیل میں ان کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہ درحقیقت ''غدیر خم'' کے مقام پر پیغمبر اسلام ﷺ کی جانب سے ولایت علیؑ کا واضح اعلان کرنا ہے۔ پھر جب وفات پیغمبر ﷺ کے بعد اکثر

افراد، جن میں بعض نے دنیاوی مقاصد اور بعض نے خوف کی وجہ سے علی علیہ السلام خلیفہء بلافصل تسلیم نہ کیا تو ایک مرتبہ رحبہ کے مقام پر حضرت علیؑ نے لوگوں کو قسم دے کر پوچھا کہ جس نے پیغمبر ﷺ سے میرے بارے میں کوئی حدیث فضیلت سنی ہو تواٹھ کر بیان کرے۔ اس کے جواب میں عبدالرحمٰن خاموش نہ بیٹھ سکے اوراٹھ کر کہا کہ میں نے غدیر خم کے مقام پر رسول خدا ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ'' (جس جس کا میں مولا و سردار ہوں، اس اس کا یہ علیؑ بھی مولا و سردار ہے۔) یہاں مناسب ہوگا کہ الاصابہ فی تمیز الصحابہ کی عبارت نقل کر دی جائے۔ العسقلانی یوں رقمطراز ہیں:

"عبدالرحمٰن بن عبدرب الانصاری ذکرہ ابن عقدہ فی کتاب المولاۃ فی من روی حدیث:من کنت مولاہ فعلیّ مولاہ وساق من طریق الاصبغ بن نباتہ قال لما نشدعلیّ الناس فی الرحبہ من سمع النبیﷺ یقول یوم غدیر خم ماقال الاقام ، ولایقوم الا من سمع، فقام بضعۃ عشر رجلاً منھم :"ابو ایوب"،"ابو زینب" و"عبدالرحمٰن بن عبد رب" فقالوا نشھد انا سمعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یقول "ان اللہ ولی وانا ولی المومنین؛ فمن کنت مولاہ فعلی مولاہ"(87)

اس عظیم محقق کی عبارت کے مطابق، دس سے زیادہ افراد کھڑے ہوئے اور گواہی دی کہ ہم نے سنا تھا کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: "بے شک اللہ ولی ہے۔ میں بھی مومنین کا ولی ہوں۔ پس جس کا میں مولا ہوں، اس کا علیؑ مولا ہے۔ ابصارالعین نے بھی بیان کیا ہے کہ "کان ھذا صحابیاً وعلمہ امیر المؤمنین القرآن ورباہ وھو احد رواۃ حدیث من کنت مولاہ...حین طلب علیہ السلام"......یعنی یہ صحابی پیغمبر ﷺ تھے۔ حضرت علیؑ نے ان کی تربیت کی اور انہیں قرآن مجید کی تعلیم دی اور من کنت مولاہ کی حدیث کو اس صحابی نے اس وقت بیان کیا جب حضرت علیؑ نے گواہی طلب کی تھی۔(88) انہوں نے پیغمبر ﷺ کی وفات کے بعد کوفہ میں سکونت اختیار کرلی۔وہ کوفہ کی معروف شخصیت تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کوفے میں امام حسینؑ کے لئے لوگوں سے بیعت طلب کرتے تھے، لیکن جب کوفہ میں امام حسینؑ کے لئے راہ ہموار کرنے میں ناکام ہوگئے تو کربلا میں امام (ع) سے ملحق ہو کر دشمن کے خلاف جنگ لڑتے ہوئے پہلے حملہ میں یا بعد از ظہر،(89) شہید ہو گئے۔

## 15-عبداللہ بن حارث بن عبدالمطلب:

کتاب ''شہدائے کربلا'' نے درج ذیل عبارت ''الاصابہ'' سے نقل کی ہے: ابوالهياج عبدالله بن ابی سفیان بن حارث بن عبدالمطلب بن هاشم الهاشمی(90) لیکن جب رجوع کیا گیا تو ہمارے ہاں موجود ''الاصابہ'' کی عبارت اس طرح تھی:"عبدالله بن الحارث بن عبدالمطلب بن هاشم الهاشمی ابن عم النبی صلی الله علیه وآله وسلم وکان اسمه عبدشمس فغیره النبیﷺ (91) ان کے والد حضرت رسول اکرم ﷺ کا چچازاد اور رضاعی بھائی تھے۔ یہ صحابی رسول ﷺ، عظیم شاعر بھی تھے اور انہوں نے پیغمبر ﷺ سے روایت بھی نقل کی ہے۔ نیز اپنے بعض اشعار میں حضرت علیؑ کی مدح و ثنا بھی بیان کی ہے۔

یہ بزرگوار حضرت رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد امام علیؑ کے ساتھ رہے۔ انہی کے ہمرکاب مختلف جنگوں میں شرکت کی۔ ایک مرتبہ جب حضرت عبداللہ کو علم ہوا کہ عمرو عاص نے بنی ہاشم پر طعن و تشنیع اور عیب جوئی کی ہے تو وہ عمرو عاص پر سخت غصہ ہوئے اور اسے مورد عتاب قرار دیا۔ یہ حضرت آخر تک اہل بیت کے ہمراہ رہے۔ انہیں جب کربلا میں حضرت امام حسینؑ کے پہنچنے کا معلوم ہوا تو ان کی خدمت میں پہنچ کر اپنی وفاداری کا عملی ثبوت دیا۔ اس طرح عاشور کے دن رسول خدا ﷺ کے نواسے کی حمایت کرتے ہوئے یزیدی فوج کے ہاتھوں شہید ہوگئے۔(92)

## 16-عمرو بن ضبیعۃ:

مختلف منابع رجال و مقاتل میں ذکر ہوا ہے کہ یہ صحابی پیغمبر ﷺ تھے اور انہوں نے کربلا میں حضرت امام حسینؑ کے ہمرکاب شہادت پائی۔ کتاب فرسان میں الاصابہ سے نقل کیا گیا ہے کہ: "هو عمروبن ضبيعه بن قيس بن ثعلبه الضبعی التمیمی له ذکرفی المغازی"... نیز ''رجال استر آبادی'' سے بھی نقل کرتے ہوئے یوں بیان ہوا ہے:"قال المحقق استرآبادی فی رجاله هو عمرو بن ضبیعه...وکان فارساً شجاعاً له ادراک(93) جناب مامقانی نے بھی انہیں صحابی اور اکی نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ تجربہ کار اور ماہر جنگجو شخص تھے۔ کئی ایک جنگوں میں شرکت کی۔ نیز شجاعت میں شہرت رکھتے تھے(94) یہ ابتدا میں عمر سعد کے لشکر کے ساتھ وارد کربلا ہوئے لیکن جب دیکھا کہ عمر سعد

نواسہ رسول ﷺ کے قتل کا ارادہ رکھتا ہے تو فوراً حضرت امام حسینؑ کے ساتھ ملحق ہوگئے۔ حملہ اولیٰ میں شہادت پائی۔ زیارت ناحیہ میں عمر کے نام سے ان کا ذکر ہوا ہے: السلام علی عمربن ضبیعه الضحی(95)

## 17- عون بن جعفر طیار:

ان کی کنیت ابوالقاسم ہے۔ یہ حضرت جعفر بن ابی طالب کے بیٹے ہیں۔ اگرچہ ان کا سن ولادت واضح طور پر بیان نہیں ہوا لیکن چونکہ یہ واقعہ کربلا میں ۵۴ یا ۵۷ سال کے تھے، لہٰذا امکان ہے کہ ۴ھ یا ۵ھ کو حبشہ میں ان کی ولادت ہوئی ہوگی۔ یعقوبی کی نقل کے مطابق حضرت رسول اکرم ﷺ نے جنگ موتہ میں حضرت جعفر طیار کی شہادت کے بعد سال ہشتم ہجری میں عون اور ان کے بھائی عبداللہ و محمد کو اپنی گود میں بٹھایا اور پیار کرتے رہے۔(96) ایک روایت کے مطابق رسول اکرم ﷺ نے حضرت جعفر طیارؓ کے بیٹوں کو بلایا اور حجام کو بلا کر کہا کہ ان بچوں کے سر کے بالوں کی درستگی کرے، اور پھر فرمایا: "عون خلقت اور اخلاق میں میری شبیہ ہے۔" یہ واقعہ الاصابہ میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔(97) جناب عون کا شمار حضرت علیؑ کے یاور و انصار میں ہوتا ہے۔ حضرت علیؑ کے ہمراہ جنگوں میں بھی شریک رہے۔ حضرت ام کلثومؑ (حضرت زینب صغریٰ ؑ) کا عقد حضرت علی (ع) نے عون سے کیا۔(98)

یہ حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد ہمیشہ امام حسن و حسین علیہما السلام کے ساتھ رہے۔ یہاں تک کہ جب حضرت امام حسین (ع) یزید بن معاویہ کے مظالم کی وجہ سے مدینہ سے روانہ ہوئے تو حضرت عون بھی اپنی زوجہ محترمہ کے ہمراہ اپنے مولا کے اس جہاد میں شریک رہے اور روز عاشور حضرت علی اکبرؑ کی شہادت کے بعد حضرت امامؑ کی اجازت سے وارد میدان ہوئے۔ ۳۰ سوار اور ۱۸ پیادہ سپاہ یزید کو واصل جہنم کیا لیکن زید رقاد جہنمی نے آپ کے گھوڑے کو زخمی کر دیا جس کی وجہ سے آپ گھوڑے پر نہ سنبھل سکے۔ پھر اس ملعون نے تلوار کا وار کر کے شہید کر دیا۔ ان کے رجز کو تاریخ نے یوں نقل کیا ہے:

ان تنکرونی فانا بن جعفر　　　شهید صدق فی الجنان ازهر

یطیر فیها بجناح اخضر　　　کفی بهذا شرفاً فی المحشر(99)

## 18-کنانہ بن عتیق:

جناب کنانہ کوفہ کے شجاع اور متقی و پرہیزگار افراد میں سے تھے اور ان کا شمار قاریان کوفہ میں ہوتا ہے۔(100) جناب کنانہ اوران کے والد باپ عتیق، حضرت رسول اکرم ﷺ کے ہمرکاب جنگ احد میں شریک ہوئے۔(101) وسیلۃ الدارین نے کنانہ کے تذکرہ کو رجال ابوعلی سے یوں نقل کیا ہے:

قال ابوعلی فی رجاله کنانة بن عتیق الثعلبی من اصحاب الحسین قتل معه بکربلا وقال العسقلانی فی الاصابه هو کنانة بن عتیق بن معاویه بن الصامت بن قیس الثعلبی الکوفی شهداء احداً هو و ابوه عتیق فارس رسول الله(ص) وقد ذکره ابن منده فی تاریخه......"(102) خلاصہ کلام یہ ہے کہ ''جناب کنانہ'' بھی ان اصحاب رسول خدا ﷺ میں سے ہیں جو حضرت امام حسین علیہ السلام کی مدد و نصرت کے لئے کربلا تشریف لائے اور اپنی جانوں کو نواسہ رسول ﷺ کے قدموں میں نچھاور کیا۔ زیارت رجبیہ اور ناحیہ میں ان پرسلام پیش کیا گیا ہے: السلام علی کنانة بن عتیق(103)

## 19- مجمّع بن زیاد جہنّی:

یہ حضرت رسول اکرم ﷺ کے اصحاب میں سے تھے۔ جنگ بدر و احد میں شریک رہے۔ مختلف منابع نے ان کو صحابی رسول ﷺ اور شہید کربلا کے عنوان سے ذکر کیا ہے؛ جیسے ذخیرۃ الدارین، حدائق، ابصار العین، تنقیح المقال، اور وسیلۃ الدارین وغیرہ۔ کتاب "الدوافع الذاتیۃ" نے "الاستیعاب" سے عبارت نقل کی ہے کہ "هو مجمّع بن زیاد بن عمرو بن عدی بن عمرو بن رفاعه بن کلب بن مودعة الجهنی شهدا بدراً و احداً اس کے عبارت کے نقل کرنے کے بعد خود ان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: اَی انّه صحابی جلیل بناءً علی ذالک... تنقیح المقال نے بھی الاصابہ اور الاستیعاب سے اس طرح کی عبارت نقل کی ہے کہ یہ صحابی رسول ﷺ تھے۔ بدر و احد میں شریک بھی رہے، لیکن ہمارے ہاں موجود الاصابہ میں یہ عبارت موجود نہیں۔

بہر حال جناب مجمع نے کوفہ میں حضرت مسلم کی بیعت کی۔ سب لوگ حضرت مسلم کو چھوڑ گئے لیکن حضرت مجمع ان افراد میں سے تھے، جو ڈٹے رہے اور کوفہ میں حالات سازگار نہ ہونے کیوجہ سے کربلا

میں حضرت امام حسینؑ سے ملحق ہو کر یزیدی ارادوں کو خاک میں ملانے کی خاطر حضرت امام حسینؑ کا ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ اپنی جان قربان کر دی۔ دشمن کربلا میں اس مجاہد کو آسانی سے شکست نہ دے سکا تو ان کا محاصرہ کر لیا گیا جس کی وجہ سے یہ شہید ہوگئے۔(104)

## 20- مسلم بن عوسجہ:

شیعہ و سنی کے تمام معتبر ترین منابع جیسے الاستیعاب، الاصابہ، طبقات بن سعد، تنقیح، تاریخ طبری وغیرہ میں ان کا ذکر موجود ہے کہ یہ صحابی رسول خدا ﷺ تھے اور صدر اسلام کے بزرگ اعراب میں شمار ہوتے تھے۔ ابتدائے اسلام کی بہت سی جنگوں میں شریک رہے۔ غزوہ آذربائیجان اور جنگ جمل و صفین و نہروان میں بھی شرکت کی۔ حضرت علیؑ کے باوفا یار و مددگار تھے۔(105) نیز مختلف نیک صفات کے مالک بھی تھے۔ شجاع و بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ قاریء قرآن، عالم علوم اور متقی و پرہیزگار، باوفا اور شریف انسان تھے۔(106) حضرت مسلم بن عقیلؑ کے کوفہ میں وارد ہوتے ہی ان کی مدد و نصرت میں پیش پیش رہے اور ان کی حمایت میں لوگوں سے بیعت بھی لیتے تھے۔ نیز مجاہدین کے لئے اسلحہ کی فراہمی اور دیگر امدادی کاروائیوں میں مصروف رہے۔(107)

حضرت مسلم و جناب ہانی بن عروہ کی شہادت کے بعد مخفی طور پر رات کے وقت اپنی زوجہ کو ساتھ لے کر حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں پہنچے۔ سات یا آٹھ محرم کو مسلم کوفہ سے کربلا پہنچ گئے اور سپاہ یزید کے خلاف ہر مقام پر پیش پیش رہے۔ جب امامؑ نے حکم دیا کہ خیموں کے اطراف میں آگ روشن کی جائے تو شمر ملعون نے آ کر توہین آمیز جملے کہے جس پر مسلم بن عوسجہ نے حضرت امام حسینؑ سے عرض کی کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں اسے ایک تیر سے ڈھیر کر دوں۔ لیکن حضرت نے فرمایا؛ نہیں۔ کیونکہ میں پسند نہیں کرتا کہ ہماری طرف سے جنگ کا آغاز ہو۔(108)

شب عاشور، جس وقت امام حسینؑ نے اپنے اصحاب کو چلے جانے کی اجازت دی، تو جہاں بعض دیگر اصحاب امام (ع) نے اپنی وفاداری کا یقین دلایا، وہاں حضرت مسلم بن عوسجہ نے جو تاثرات بیان کئے، وہ سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہیں۔ عرض کی: ''خدا کی قسم! ہرگز آپ کو چھوڑ کے نہیں جاؤں گا۔ یہاں تک کہ اپنے نیزے کو دشمن کے سینے میں توڑ نہ دوں۔ خدا کی قسم۔ اگر ستر بار مجھے قتل کر دیا

جائے۔ پھر جلا کر راکھ کر دیا جائے اور میں ریزہ ریزہ ہو جاؤں۔ اور اگر پھر زندہ کیا جاؤں، تب بھی میں آپ سے جدا نہیں ہوں گا......یہاں تک کہ ہر بار آپ پر اپنی جان قربان کتا رہوں گا۔ اس لئے کہ جان تو ایک ہی جائے گی، لیکن عزت ابدی مل جائے گی۔''(109)

حضرت مسلم بن عوسجہ، ایسے عظیم صحابی رسول ﷺ و صحابیء امام ہیں جن کو حضرت امام حسینؑ نے ایک آیت قرآنی کا مصداق قرار دیا۔ جب مسلم بن عوسجہ پچاس دشمنوں کو ہلاک کرنے کے بعد شہید ہو گئے تو حضرت امام (ع) فوراًان کی لاش پر پہنچے اور فرمایا: ''خدا تم پر رحمت کرے اے مسلم۔'' پھر سورۂ احزاب کی آیت ۲۳ کی تلاوت کی: (فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا) اس طرح امام نے اپنے نانا رسول اللہ ﷺ کے صحابی کو الوداع کہا :السلام علی مسلم بن عوسجه الاسدی...وکنت اول من اشتری نفسه واول شهید شهدالله

## 21- نعیم بن عجلان:

ایک روایت کے مطابق نعیم اوران کے دو بھائیوں، نظر و نعمان نے حضرت رسول اکرم ﷺ کو پایا۔ اس طرح یہ صحابی ادراکی ہیں۔ یہ لوگ خزرج قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد امام علی علیہ السلام کے ساتھ جنگ صفین میں حضرت کا ساتھ دیا۔ حضرت علیؑ نے ان کے بھائی نعمان کو بحرین کے علاقے کا والی بنایا۔(110) نعیم کے دونوں بھائی حضرت امام حسنؑ کے زمانہ میں انتقال کر گئے جبکہ نعیم کوفہ میں زندگی بسر کر رہے تھے کہ اس بات پر مطلع ہوئے کہ حضرت امام حسینؑ عراق میں وارد ہوچکے ہیں۔ چنانچہ یہ کوفہ کو ترک کرتے ہیں، حضرت امام (ع) کی خدمت میں حاضر ہو کر غیرت دینی کا عملی ثبوت پیش کرتے ہیں اور نواسہء رسول ﷺ کے ساتھ اپنی وفاداری کا اعلان کرتے ہوئے سپاہ یزید کے خلاف جنگ میں اپنے خون کا آخری قطرہ بھی قربان کر دیتے ہیں۔(111)کتاب مناقب کے مطابق انہوں نے روز عاشور اولین حملہ میں جام شہادت نوش کیا۔ (112)زیارت ناحیہ اوررجبیہ میں ان پرسلام ذکر ہوا ہے: السلام علی نعیم بن العجلان الانصاری(113)

*****

# حوالہ جات

1۔ نیل الاوطار، ج۷، ص۱۲۷از ثورۃ العین ص ۳۲۔

2۔خلافت وملوکیت، ص۱۷۹۔

3 ۔ ابن حجر، الِاصابۃ، جلد 1، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، 1415، ص ۱۳۰۔

4 ۔ محمد بن المشدی، المزار، تحقیق : جواد القیومی الاصفہانی، قم، نشر القیوم، 1419، ص

5۔وسیلۃ الدارین، ص۱۰۶۔

6۔فرسان الھیجاء، ذبیح اللہ محلاتی، ص۳۶۔

7۔ شہدائے کربلا، گروہ مصنفین، ص۳۵۸۔

8۔سورۂ فتح، آیت ۱۷۔

9۔تنقیح المقال، مامقانی، ج۱، ص ۱۵۴۔

10۔ مقتل الحسین، مقرم، ج۲ص ۲۵۳۔

11۔الاستعیاب، ابن عبداللہ، ج۱، ص۱۱۲۔

12۔یہ ذکر درج ذیل کتب میں بھی موجود ہے:اسد الغابہ،ابن اثیر،ج۱،ص۱۲۲۔تاریخ الکبیر،بخاری،ج۲، ص۳۰۔ الاصابہ فی تمییز الصحابہ،ابن حجر العسقلانی،ج۱،ص۲۷۰۔

13۔فرسان الھیجاء، محلاتی، ص۳۷۔

14۔تاریخ الکبیر، بخاری، ج۲، ص۲۰۔

15۔مثیر الاحزان، ص۱۷۔

16۔اسد الغابہ، ابن اثیر، ج۱، ص ۱۲۳۔

17۔انساب الاشراف، بلاذری، ج۳، ص۱۷۵(دار التعارف)

18۔فرسان الھیجاء، ص۳۷۔

19۔ حیاۃ الامام الحسین، ج ۳، ص ۲۳۴۔

20۔ الفتوح، ج ۵، ص ۱۹۶۔

21۔ الاقبال، ج ۳، ص ۳۴۴۔

22۔ منتھی الآمال، ج ۱، ص

23۔ الاصابہ، ج ۱، ص ۳۴۹۔

24۔ ایضاً، ص ۱۱۸۔

25۔ فرسان الھیجاء، ص ۵۴۔

26۔ تنقیح المقال، ج ۱، ص ۱۹۸۔

27۔ وسیلۃ الدارین، زنجانی، ص ۱۱۲۔

28۔ مقتل الحسین، ابی مخنف، ص ۱۱۶، ۱۱۵۔

29۔ زندگانی امام حسین، رسول محلاتی، ص ۲۵۲۔

30۔ تنقیح المقال، مامقانی، ج ۱، ص ۲۳۴ (تین مجلد)

31۔ فرسان الھیجاء، ص ۷۶۔

32۔ تنقیح المقال، ج ۲، ص ۳۲۷۔

33۔ حماسہ ء حسینی، استاد شہید مطہری ج ۲، ص ۳۲۷۔

34۔ شہدائے کربلا۔ عبدالحسین بینش، ص ۲۸۲۔

35۔ تاریخ طبری، ج ۵، ص ۲۲۶۔

36۔ ایضاً

37۔ انساب الاشراف، البلاذری، ج ۳، ص ۱۹۸۔

38۔ قاموس الرجال، ج ۲، ص ۲۴۷۔

39۔ الکامل فی التاریخ، ابن اثیر، ج ۴۷، ۴۔

40۔ تنقیح المقال، ج ا، ص ۲۳۴۔

41۔ شہدائے کربلا عبد الحسین بینش، ص ۱۱۵۔

42۔ اقبال الاعمال، ج ۳، ص ۷۸۔

43۔ شہدائے کربلا عبد الحسین بینش، ص ۱۳۶۔

44۔ وسیلۃ الدارین، ص ۱۱۴۔

45۔ تاریخ اسلام، ابن عساکر، ج ۱۱، ص ۳۰۳۔

46۔ تنقیح المقال، ج ا، ص ۲۳۶۔

47۔ رجال، شیخ طوسی، ص ۷۲، اقبال، ج ۳، ص ۳۴۶۔

48۔ شہدائے کربلا۔ عبد الحسین بینش، ص ۱۳۶۔

49۔ رجال، شیخ طوسی، ص ۶۸، ۳۸۔

50۔ الاصابہ، حرف ''حا'' (حبیب بن مظاہر )

51۔ سفینۃ البحار، ج ۲، ص ۲۶۔

52۔ بحار الانوار، مجلسی، ج ۴۰، ص ۳۱۱۔ (تسبیح یعنی سبحان اللہ' تحمید یعنی الحمد اللہ، اور تہلیل یعنی لاالہ الا اللہ کہنا)

53۔ تاریخ الطبری، ج ۵، ص ۳۵۲۔

54۔ ایضاً، ج ۵، ص ۳۵۵۔

55۔ ابصار العین، ساوی، ص ۷۸۔

56۔ اعیان الشیعہ، ج ۲، ص ۵۵۴۔

57۔ اسرا الشھادہ، ص ۳۹۶۔

58۔ شہدائے کربلا، ص ۱۳۴۔

59۔ الفتوح، ج ۵، ص ۱۵۹۔

60۔ اخیار الرجال، الکشی، ص ۷۹۔

61۔الدّمعۃالساکبہ، ج۴، ص ۲۷۴۔

62۔ شہدای کربلا، ص۱۳۵۔

63۔فرسان الھیجاء ص۱۳۸از وسیلۃالدارین، ص۱۳۷۔

64۔اسد الغابہ، ابن اثیر علی بن محمد، ج۲، ص ۱۹۲، الاصابہ، ج۱، ص ۵۴۲۔

65۔ قاموس الرجال، شوشتری، ج۲، ص۴۰۶، ۴۰۲

66۔ تنقیح المقال، ج۱، ص۴۳۸۔

67۔ شہدای کربلا، ص ۱۶۴، از تنقیح، ج۱، ص۴۳۷ تاریخ مدینہ دمشق، ج۲۵، ص ۵۰۲۔

68۔اقبال، ص۷۹۔

69۔ جمھرۃانساب العرب، ص۳۹۵۔

70۔ابصارالعین، سماوی، ص ۱۳۴، عنصر شجاعت، ج۲، ص ۹۴۔

71۔فرسان الھیجاء، ص ۱۵۴۔

72۔ایضاً

73۔ تنقیح المقال، ج۲، ص ۱۲۔

74۔ شہدای کربلا، ص ۱۸۰۔

75۔ قاموس الرجال، شوشتری، ج۵، ص۲۸، ۲۷۔

76۔وسیلۃالدارین، ص ۱۵۵ نقل از الاصابہ، ج۳، ص ۳۰۵۔

77۔فرسان الھیجاء، ص۱۶۷۔

78۔ وسیلۃالدارین، ص ۱۵۴۔

79۔ شہدائے کربلا، ص۱۹۸۔

80۔اقبال، ص۳۴۶۔

81۔ عنصر شجاعت، ج۱، ص ۱۳۰۔

82۔ یاران پائیدار، ص۹۷۔
83۔ تاریخ الطبری، ج۵، ص۳۵۲۔
84۔ الفتوح، ج۵، ص۴۸۔
85۔ انساب الاشراف، ج۳، ص۱۹۶۔
86۔ الاقبال، ج۳، ص۷۹۔
87۔ الاصابہ، ج۲، ص۳۲۸۔
88۔ ابصار العین فی انصار الحسین، ص۹۲۔
89۔ ذخیر الدارین، ص۲۷۰۔
90۔ شہدائے کربلا، ص۲۲۸ نقل از الاصابہ، ج۷، ص۱۵۱۔
91۔ الاصابہ، ج۴، ص۲۷۔
92۔ شہدائے کربلا، ص۲۲۹۔
93۔ فرسان الھیجاء، ج۲، ص۷۔
94۔ تنقیح المقال، ج۲، ص ۳۳۲
95 ۔ الاقبال، ج۳، ص۷۸۔
96۔ تاریخ یعقوبی، ج۲، ص۶۵۔
97۔ الاصابہ، ج۴، ص۴۷ نمبر شمار ۶۱۱۱۔
98۔ تنقیح المقال، ج۲، ص۳۵۵۔
99۔ مقتل الحسین، خوارزمی، ج۲، ص۳۱۔
100۔ ابصار العین، ص۱۹۹۔
101۔ تنقیح المقال، ج۲، ص۴۲۔
102۔ وسیلۃ الدارین، ص۱۸۴۔

103۔الاقبال، ص۷۸۔

104۔ابصار العین، ص۲۰۱۔

105۔فرسان الھیجاء، ج۲، ص۱۱۶۔

106۔تنقیح المقال، ج۳، ص۲۱۴۔

107۔الکامل فی التاریخ، ج۴، ص۳۔

108۔تاریخ الطبری، ج۵، ص۴۲۴۔

109 ۔ ایضاً، ج۵، ص۴۱۹۔

110 ۔ تنقیح المقال، ج۳، ص۲۷۴۔

111 ۔ ایضاً۔

112 ۔ مناقب آل ابی طالب، ج۴، ص۱۲۲۔

113 ۔ الاقبال، ج۳، ص۷۷۔

# اہل بیت علیہم السلام کی عزاداری

## Mourning of Ahlul Bayt (as)

حجۃالاسلام محمد اصغر عسکری

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آئمہ اطہارؑ نے حالات زندگی کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے تبلیغی انداز کو ہمیشہ زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ رکھا ہے اور ان کا اصول تبلیغ یہی تھا کہ بات کو حالات کے مطابق ہونا چاہیئے، ورنہ وہ نہ صرف بے اثر ہوجائے گی بلکہ بسا اوقات مضر اور نقصان دہ بھی ثابت ہو گی۔ لہٰذا انہی حالات کے تحت امر واقعہ یہ تھا کہ کبھی ایک امام نے تبلیغ کی خاطر خطبہ کی زبان اختیار کی تو دوسرے امام نے دعا کی۔ لیکن واقعہء کربلا کے بعد تبلیغ کی ایک اور زبان ایجاد ہو گئی، جس کا نام عزاداری تھا۔

عزاداری درحقیقت آئمہ معصومین کے تبلیغی مشن کے ایک انتہائی محتاط عنصر کا نام تھا جہاں بظاہر اپنے حالات اور خاندان والوں پر گذرنے والے مصائب پر گریہ کیا جاتا تھا جس سے عام طور پر ہر شخص کو ہمدردی ہو جاتی ہے اور کوئی شخص اس کی مخالفت نہیں کرتا۔ لیکن فی الحقیقت اس گریہ و غم کے سائے میں دین کے عظیم پیغام کو نشر کیا جاتا تھا۔ چنانچہ پیغمبر گرامی اسلام ﷺ سے لے کر امام زمانہ علیہ السلام تک، جس قدر حالات نے اجازت دی ہے، ہر امام نے تبلیغ دین کے اس عنصر پر زور دیا ہے اور فرش عزا بچھا کر ایک طرف تو لوگوں کو ان عوامل کو تلاش کرنے کا جذبہ دیا کہ جس کے باعث یہ حالات اور مصائب پیش آئے تھے؛ اور اس طرح اس دین تک پہنچنے کا موقع فراہم کیا، جس کی تبلیغ کے لئے یہ مصائب برداشت کیے گئے تھے۔ دوسری طرف ذکر مصائب کے ذیل میں ان تبلیغات کا بھی انتظام کیا گیا جو آئمہ طاہرین کی زندگی اور ان کے منصب کا نصب العین تھا۔ تبلیغ کی اس زبان اور عزاداری کے عنوان کے تحت آئمہ ہدیٰ علیہم السلام نے تفسیر، حدیث، تاریخ، احکام اور عقائد، سب کا تذکرہ فرمایا ہے۔ حالانکہ عزاداری کا لفظی مفہوم تو صرف غم منانا اور صبر و سکون کا سامان فراہم کرنا ہے جس سے ان مسائل کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ذیل میں ہم رسول گرامی اسلام ﷺ اور دیگر آئمہ ہدیٰ علیہم السلام کی

زندگی کا ایک جائزہ اس حوالے سے پیش کرتے ہیں کہ ان مقدس ہستیوں نے عزاداری کا کیسا انداز اپنایا اور اپنے زمانے کے حالات کے مطابق کیا روش اپنائی ہے؟

## خاتم الانبیاء ﷺ کی عزاداری

اگرچہ کربلا والوں کی عزاداری کی تاریخ حضرت آدمؑ سے شروع ہوتی ہے اور تاریخ انسانیت ہی ایک لحاظ سے تاریخ عزاداری ہے۔ نیز انبیاء کو وحی کے ذریعے مستقبل میں ۶۱ھ میں رونما ہونے والے اس واقعہ کے بارے میں بتایا گیا۔ چنانچہ انبیاء نے اپنے اپنے انداز سے عزاداری بھی کی ہے لیکن چونکہ ہمارا موضوع آئمہ و اہل بیتؑ کی عزاداری ہے، لہٰذا ہم انبیاء کے سردار حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے دور سے بات کا آغاز کرتے ہیں۔ پیغمبر گرامی اسلام ﷺ، کہ جن کا قول، فعل اور تقریر تمام مسلمانوں کے لئے حجت ہے اور جن کی ہر بات کی سچائی کی گواہی قرآن نے دی ہے، کو اپنے نواسہ کی شہادت سے قبل جب جبرائیل امینؑ نے کربلا کے واقعات کے بارے میں بتایا تو آنجناب ﷺ کتنے متاثر اور غمگین ہوئے؟ اس حوالے سے ہم چند احادیث بیان کرتے ہیں:

پیغمبر گرامی اسلام ﷺ ام سلمیٰ کے حجرے میں تشریف فرما تھے۔ آپ ﷺ نے ام سلمیٰؑ سے فرمایا کہ ابھی کسی کو میرے پاس نہ آنے دیں۔ ام سلمیٰ مزید روایت کرتی ہیں کہ پیغمبر گرامی اسلام ﷺ میرے حجرے میں آرام فرما رہے تھے کہ اسی دوران امام حسین علیہ السلام، جبکہ آپ کا بچپنا تھا، داخل ہوئے۔ ام سلمیٰ کہتی ہیں کہ میں حضرت امام حسینؑ کو نہ روک سکی۔ امام حسینؑ اپنے نانا کے حجرے میں داخل ہوئے اور میں بھی آہستہ آہستہ پیچھے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے دیکھا کہ امام حسینؑ اپنے نانا کے سینے پر سوار ہیں، خدا کے رسول ﷺ گریہ کر رہے ہیں اور آپ کے ہاتھ میں کوئی چیز ہے۔ رسول اسلام ﷺ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''اے ام سلمیٰؑ! مجھے ابھی ابھی جبرائیل نے خبر دی ہے کہ میرا بیٹا حسینؑ قتل کیا جائے گا۔ پھر پیغمبر ﷺ کے ہاتھ میں جو تربت تھی، وہ آپ ﷺ نے مجھے دے دی اور فرمایا۔ اسے اپنے پاس محفوظ کرلو۔ اسے دیکھتی رہنا۔ جب یہ تربت خون میں بدل جائے تو سمجھ لینا کہ حسین ﷺ کو قتل کر دیا گیا ہے۔

ام سلمیٰ نے کہا: "یا رسول اللہ ﷺ، آپ خدا سے دعا کریں کہ خدا حسینؑ کو اس مصیبت سے محفوظ رکھے"۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "میں نے التجا کی ہے مگر میرے اوپر وحی نازل ہوئی ہے کہ حسینؑ

کے لئے خدا کے ہاں ایسا مقام ہے کہ کوئی دوسرا اس تک نہیں پہنچ سکتا، وہ اپنے شیعوں کی شفاعت کریں گے اور مہدی آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے فرزندوں میں سے ہوں گے۔ پس خوش نصیب ہیں وہ لوگ، کہ جو حسینؑ سے محبت کرنے والے اور ان کے شیعہ ہوں گے۔ خدا کی قسم۔ ان کے شیعہ قیامت کے دن کامیاب ہوں گے۔(1)

پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امام حسین علیہ السلام کی ولادت کے وقت سے ہی عزاداری و گریے کا سلسلہ قائم کر دیا تھا۔اسماء روایت کرتی ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو امام حسین کی ولادت کی خبر ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جلدی سے حضرت سیدہ (ع) کے گھر گئے، جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرہ انور سے غم و حزن کے آثار نمایاں تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حزن آلود آواز میں فرمایا : "اے اسماء۔ میرے بیٹے کو لے آؤ۔" بچے کو لایا گیا اور پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک میں تھمایا گیا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بچے کو آغوش میں لیا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کا بوسہ بھی لیتے تھے اور ساتھ ساتھ گریہ بھی فرماتے تھے۔ اسماء کہتی ہیں کہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس کیفیت کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئی اور عرض کیا: "اے خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ! میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان ہوں،آپ کس لئے گریہ فرما رہے ہیں؟"

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اپنے اس بیٹے کے لئے گریہ کر رہا ہوں۔" اسماء بہت حیران ہوئیں اور عرض کیا: "یہ فرزند تو ابھی متولد ہوا ہے۔ اس کے لئے کیوں گریہ کر رہے ہیں؟" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تقتله الفئة الباغية من بعدى لا أنالهم والله شفاعتى "اس فرزند کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔ خدا کی قسم۔ میری شفاعت ہرگز ان کو نہیں ملے گی۔" اسماء کہتی ہیں کہ پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی جگہ سے اٹھے اور غم واندوہ کی حالت میں فرمایا: "اسماء۔ اس واقعہ کے بارے میں فاطمہؑ کو نہ بتانا کیونکہ وہ ابھی ابھی اس فرزند کی ماں بنی ہیں۔"(2)

معجم طبرانی میں اسی سے مشابہہ ایک اور روایت نقل کی گئی ہے اور اس کے علاوہ بہت ساری احادیث پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہوئی ہیں جس میں واقعہ کربلا پر آپ کا گریہ کرنا اور سوگوار رہنا ثابت ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جہاں حسینؑ کی مظلومیت پر آنسو بہاتے تھے، وہاں حسینؑ کی حقانیت کو بھی واضح فرماتے تھے۔ بعض اوقات جب خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زیب منبر ہوتے تھے اور اپنے صحابہ کو خطبہ ارشاد فرما رہے ہوتے اور اس دوران حسین وارد بزم ہوتے تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنا منبر چھوڑ دیتے، بچے

کوآغوش میں لیتے اور پھر لوگوں سے کہتے کہ هذا حسين فاعرفوه وانصروه "یہ میرا حسین ہے اس کو پہچان لواوراس کی مدد کرو۔"

رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:(أنّ لقتل الحسين حرارة فى قلوب المومنين لاتبرد أبداً)''بے شک حسینؑ کی شہادت سے مومنین کے دلوں میں ایسی حرارت پیدا ہوگی کہ جو کبھی بھی ٹھنڈی نہیں ہوگی۔''

یہ فرمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جہاں ایک خبر ہے وہاں یہ امر وانشاء بھی ہے۔ یعنی رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ چاہتے ہیں کہ مومنین اس عظیم قربانی کو، کہ جس نے اپنی قربانی دے کر ہمیشہ کے لئے اسلام کوزندہ کردیا، یادرکھیں، اور حرارت کے لفظ سے تعبیر فرمانا بھی بے مقصد نہیں ہے، بلکہ اس میں حکمت پنہاں ہے کہ حسینؑ کوایسے یادرکھوکہ دلوں میں تحرک وبیداری پیدا ہوجائے۔ نہ کہ ایسی یاد کہ جوانسان کواپنی ذمہ داریوں سے غافل کردے اوربے کاربنادے۔ لہٰذا حقیقی عزادار کی نشانی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی ذمہ داریوں کوادا کرنے میں متحرک اورپرجوش دکھائی دیتاہے۔

## حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام کی عزاداری

جیساکہ رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امام حسینؑ کی شہادت سے قبل آپ کی شہادت اورمصیبت عظمیٰ کے حوالے سے بہت کچھ بیان فرمایا تھا، ایسے ہی حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام نے بھی بہت ساری روایات بیان فرمائی ہیں۔ بطور نمونہ ہم صرف دوروایتوں کو بیان کرتے ہیں:

1-ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ ہم امیرالمؤمنین کے ساتھ صفین کی طرف جارہے تھے۔ جب ہم فرات کے کنارے نینواکے مقام پر پہنچے توحضرت نے بلندآواز سے فرمایا: "ابن عباسؓ! کیااس سرزمین کو پہچانتے ہو؟" میں نے کہا: "نہیں۔" حضرت نے فرمایا: "اگرتماس سرزمین کو پہچانتے ہوتے تومیری طرح روتے ہوئے گذرتے۔ ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ پھر حضرت کافی دیرتک گریہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ کے محاسن مبارک آنسوؤں سے ترہوگئے۔ پھرفرمایا: "اے وائے! میں نےآل سفیان کا کیابگاڑا ہے؟وائے اے شیطان کے گروہ اورشیطان کے دوست۔ اے ا باعبداللہؑ صبر کرو۔" ......پھرفرمایا: " اے ابن عباس۔ واقعی ایسا ہی ہے جیسا دیکھ رہاہوں کہ میرے بدن کاٹکڑا حسینؑ اس

سرزمین پر استغاثہ کر رہا ہے اور کوئی اس کے استغاثے کا جواب نہیں دے رہا۔ یہ زمین، کربلا ہے کہ جہاں حسینؑ اور میرے اور فاطمہؑ کے سترہ فرزند دفن ہوں گے۔ کربلا کی زمین اہل آسمان کے نزدیک معروف و مشہور ہے اور وہ کربلا کو ایسے یاد کرتے ہیں جیسے حرمین شریفین اور بیت المقدس کو یاد کیا جاتا ہے۔" (3)

2-ہرثمہ بن ابی مسلم نے بھی اس سے مشابہہ ایک روایت نقل کی ہے: وہ کہتا ہے کہ میں جنگ صفین میں علی علیہ السلام کے ساتھ تھا۔ واپسی پر ہم کربلا پہنچے تو حضرت نے نماز صبح پڑھی۔ پھر کربلا کی کچھ خاک کو اٹھایا، سونگھا اور فرمایا: "اے کربلا کی خاک۔ تو خوش قسمت ہے کہ تجھ سے ایک گروہ اٹھے گا جو بغیر حساب کے بہشت میں داخل ہوگا۔" ہرثمہ کہتا ہے کہ جب میں اپنی مومنہ بیوی کے پاس گیا اور اس واقعے کے بارے میں بتایا تو اس نے کہا: "أمیر المؤمنین بغیر حکمت کے کوئی بات نہیں فرماتے۔"

جب عبید اللہ ابن زیاد نے اپنے لشکر کو کربلا بھیجا تو یہی ہرثمہ، ابن زیاد کے لشکر میں تھا۔ جیسے ہی یہ کربلا کی زمین پر پہنچا تو اس نے اس سرزمین کو پہچان لیا اور امیر المؤمنین کی بات اس کو یاد آ گئی۔ چنانچہ وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور امام حسینؑ کی طرف چلا آیا اور واقعہ کے بارے میں بتایا۔ امام حسین علیہ السلام نے فرمایا: "ابھی تو میری مدد کے لئے آیا ہے یا میرا دشمن ہے؟" اس نے کہا: دونوں میں سے کچھ بھی نہیں۔ البتہ کوفہ میں میری ایک بیٹی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ ابن زیاد اس کو قتل نہ کر دے۔ امام نے فرمایا: "پس چلا جا اور میری شہادت کو نہ دیکھ اور میرے استغاثہ کو نہ سن۔" پھر فرمایا: "اس خدا کی قسم، کہ جس کے ہاتھ میں حسین (ع) کی جان ہے، کہ جو شخص بھی میری فریاد کو سنے اور میری مدد نہ کرے، تو خدا اس کو اوندھے منہ جہنم میں ڈالے گا۔ (4) ان دونوں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کربلا کی سرزمین سے جس نبی یا ولی کا بھی گذر ہوا ہے، اس نے واقعہ کربلا کا ذکر کیا ہے اور ایک خاص رد عمل بھی ظاہر کیا ہے نیز کربلا کی خاک کا ایک خاص انداز میں تکریم و احترام کیا ہے۔

حضرت فاطمہ زہراؑ کے متعلق کتب میں موجود ہے کہ جب رسول خدا ﷺ نے حضرت سیدہؑ کو امام حسینؑ کی شہادت کی خبر سنائی تو آپ (ع) نے شدید گریہ کیا اور پوچھا: "بابا جان۔ یہ واقعہ کب ہوگا؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "بیٹی۔ جب نہ میں ہوں گا، نہ تو ہوگی، نہ علیؑ اور نہ حسنؑ ہوں گے۔ جناب سیدہؑ کا گریہ بڑھ گیا اور عرض کی: " بابا جان۔ کیا میرے بیٹے پر کوئی رونے والا نہیں ہوگا؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "بیٹی۔ خداوند ایک ایسی قوم پیدا کرے گا جن کی خواتین میری ذریت کی خواتین پر روئیں گی۔ جن

کے مرد میرے اہل بیت کے مردوں پر روئیں گے اور ہر سال اس غم کو تازہ کریں گے۔ قیامت کے دن تم ان خواتین کی اور میں ان مردوں کی شفاعت کروں گا۔"

ان سارے واقعات میں اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شہداء کربلا کی عزاداری آئمہ علیہم السلام نے خود بھی کی ہے اور دوسروں میں بھی عزاداری کرنے کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس لئے کہ یہ گریہ وعزاداری شعار زندگی ہے۔ گریہ شرافت آدم ہے۔ گریہ تہذیب انسانیت ہے۔ یہ عزاداری ایک طرف تو مظلوم کی مظلومیت پر گریہ ہے تو دوسری طرف ظالم کے خلاف نفرت کا اظہار بھی ہے۔ اس لئے آئمہ علیہم السلام کی تاکید ہے کہ اس ماتم وعزاداری کو زندہ رکھیں کیونکہ اگر عزاداری زندہ ہے تو اسلام زندہ ہے۔ پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر امام زمانہ علیہ السلام تک ہر امام نے اور خاندان اہل بیتؑ کے ہر فرد نے عزاداری کی ہے اور صف ماتم بچھائی ہے۔ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو جب زہر دیا گیا تو بیان کیا گیا ہے کہ امام حسینؑ نے گریہ کیا اور بھائی کی مصیبت پر آنسو بہائے۔ امام حسن علیہ السلام نے فرمایا: ( لایوم کیومک یااباعبداللہ ) ''اے بھائی حسینؑ! جتنی تیری مصیبت بڑی ہو گی، اس سے بڑھ کر کوئی مصیبت کا دن نہیں ہے۔''

البتہ یہاں مناسب ہے کہ اس مطلب کو بھی واضح کردیں کہ گریہ وعزاداری وسیلہ وذریعہ نہیں بلکہ بذاتہ مطلوب ہے اور بعض حضرات جو اپنے آپ کو روشن فکر گردانتے ہیں، یہ تصور کرتے ہیں کہ عاشورا اور کربلا کی یاد منانا صرف روایتی عزاداری ( سینہ زنی' گریہ' سیاہ لباس......وغیرہ) میں منحصر نہیں ہے۔ بلکہ اس مقصد کو اور طریقوں اور دوسرے ذرائع جیسے کانفرنس، سیمینار، محفل ومذاکرے وغیرہ سے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ واقعہ عاشورا اور پیغام عاشورا کو سمجھنے کے لئے اسی انداز سے روایتی عزاداری، سینہ زنی، گریہ وغیرہ کی ضرورت ہے۔ اگرچہ حضرت سید الشہداء کی شخصیت کے بارے میں کانفرنس، سیمینار اور علمی وتحقیقی مقالات وغیرہ بھی بہت مفید ولازم ہیں مگر روایتی عزاداری کا انداز بھی ضروری اور لازم ہے۔ اس نکتے کو واضح کرنے کے لئے ایک بطور مقدمہ ایک بحث ضروری ہے۔

سب سے پہلے یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ انسان کے اندر کون سے عوامل ہیں جو اس کے کاموں پر اثر انداز ہو سکیں؟ علماء اور ماہرین نفسیات اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسان کے اندر دو اہم عوامل موجود ہیں۔ ایک تو شناخت ومعرفت والا عامل ہے، یعنی حس شناخت ، جو باعث بنتی ہے کہ انسان کسی چیز کو سمجھے،

اور جاننے اور سمجھنے کے بعد پھر اس کو قبول کرے۔ اور دوسرا عامل جو ہر انسان کے اندر پایا جاتا ہے، اور جو شناخت والے عامل سے بھی زیادہ مؤثر ہے، وہ انسانی احساسات اور جذبات ہیں۔ آپ اپنی روزمرہ زندگی میں بھی اس کا مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ سب سے زیادہ مؤثر عامل یہی احساسات وجذبات والا عامل ہی ہے جو انسان کو کسی ذمہ داری کو انجام دینے پر آمادہ کرتا ہے۔ خواہ وہ انفرادی ذمہ داری ہو یا اجتماعی وسیاسی ذمہ داری ہو۔ لہٰذا ہم جس کام کو بھی انجام دینا چاہیں، اس کے لئے صرف اس کام کی شناخت ومعرفت کافی نہیں ہوتی اور صرف اس کا جان لینا ہی ہمیں حرکت میں نہیں لاسکتا بلکہ یہ احساسات وجذبات ہی ہیں جو انسان میں مذکورہ کام کے انجام دینے کی ترغیب پیدا کرتے ہیں اور اسے تحریک دلاتے ہیں، اور جب تک یہ عامل نہ ہو، کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ صرف یہ جان لینا کہ فلاں کھانا مفید ہے، انسان کے لئے کافی نہیں ہے اور اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا جب تک اس کو بھوک نہ لگے اور وہ اس کھانے کو کھا نہ لے۔ ایسے ہی بعض دیگر امور کی کیفیت ہوتی ہے کہ صرف ان کا علم کافی نہیں ہوتا جب تک کہ کوئی ترغیب کا عامل پیدا نہ ہو کہ جو انسان کے اندر تحریک پیدا کرے۔ اس مقدماتی بحث کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ تحریک کربلا سے صرف آگاہی اور صرف اسے جان لینا کافی نہیں ہے۔

بلکہ امام کے اس مقدس مشن سے ہم آہنگ ہونے کے لئے ایک ترغیب کی ضرورت ہے جو ہمیں اس مقدس تحریک کا حصہ بننے پر آمادہ کرے۔ کیونکہ تحریک کربلا ایک مسلسل اور پیہم جدوجہد کا نام ہے جو ہر دور کے انسان کو آزادی سے جینے کا سلیقہ سکھاتی ہے اور انسانیت کو یہ درس دیتی ہے کہ ایک مقدس ہدف کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینا چاہیے۔ لہٰذا عزاداری کا رائج انداز، سینہ زنی و گریہ وغیرہ کربلا کے واقعہ کی منظر کشی میں زیادہ مؤثر ہے اور کربلا کے پیغام کو اس انداز سے بہتر طور پر منتقل کیا جا سکتا ہے کیونکہ سننے اور دیکھنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ اور سامری کی داستان اس نکتے پر بہترین دلیل ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر بلایا گیا تو لوگوں کو بتایا گیا کہ ایک مہینے کے لئے حضرت موسیٰؑ کوہ طور پر رہیں گے مگر خدا نے دس دن اور بڑھا دیے۔ : (وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ)۔ جب تیس دن ختم ہوئے تو بنی اسرائیل کی قوم حضرت ہارون کے پاس آئی اور کہا: "تیرا بھائی کیوں نہیں آیا؟" حضرت ہارونؑ نے فرمایا: "آپ

منتظر رہیں۔آ جائے گا۔" غرض دس دن مزید گزر گئے۔ادھر سامری نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ایک بچھڑا بنا ڈالا اور کہا : ( هٰذَآ اِلٰـهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ) تو قوم موسیٰ (ع) نے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔ خدا نے حضرت موسیٰؑ پر وحی نازل کی کہ آپ کی قوم نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے سنا لیکن کوئی رد عمل نہ دکھایا۔ دس دن اور گذرے تو چالیس دن کے بعد موسیٰ (ع) آسمانی الواح کو لوگوں کے پاس لائے تاکہ ان کو شریعت کے احکام اور خدا کی اطاعت کی دعوت دیں۔جب حضرت موسیٰؑ نے یہ منظر دیکھا کہ قوم بچھڑے کی پرستش کر رہی ہے تو غضبناک ہوئے، آسمانی الواح کو کلیم اللہ نے اٹھا پھینکا: ( وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ ) اپنے بھائی کو سر کے بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور کہا: "تم نے قوم کو گمراہ ہونے سے کیوں نہیں روکا؟" اگر اس داستان میں غور کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ حضرت موسیٰؑ کو کوہ طور پر وحی کے ذریعے خدا نے یہ سب بات بتادی تھی لیکن اس خبر کو سننے کے بعد حضرت موسیٰ نے کوئی رد عمل نہیں دکھایا اور ان میں غم و غصے کے کوئی آثار نہیں تھے لیکن جب خود اپنی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھا تو وہ غضبناک ہوئے اور برداشت نہ کر سکے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سننے اور دیکھنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔خدا نے انسان کو ایسے خلق کیا ہے کہ جب وہ کسی چیز کو دیکھے اور کسی منظر کا مشاہدہ کرے تو فورا متاثر ہوتا ہے جبکہ سننے سے ایسا اثر نہیں لیتا۔

اگرچہ ہم واقعہ کربلا کے بارے آگاہی رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ امام حسینؑ اور آپ کے باوفا انصار واصحاب کی مظلومانہ شہادت کیسے ہوئی ہے مگر محض ہمارا جاننا ہمارے آنسوؤں کو جاری نہیں کر سکتا بلکہ جب ہم مجلس عزا میں شریک ہوتے ہیں، مرثیہ خوان مرثیہ پڑھتا ہے اور خطیب خوبصورت اور مؤثر انداز میں کربلا کی داستان بیان کرتا ہے تو پھر بے اختیار ہمارے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا واضح ہو جاتا ہے کہ صرف واقعہ کربلا پر عالمانہ اور محققانہ بحث کرنے نیز سیمینار وں اور کانفرنسز کے انعقاد سے عزاداری جیسی افادیت کو حاصل نہیں کیا جاسکتا، بلکہ لوگوں کے احساسات کو تحریک دینے کے لئے ضروری ہے کہ سیاہ لباس پہنا جائے، عزاخانوں کو سیاہ پرچموں سے سجایا جائے اور باقاعدہ مجالس عزا اور عزاداری کے پروگرام منعقد کیے جائیں تاکہ احساسات کو تحریک دیجاسکے۔ لہٰذا عزاداری ایک سیاسی وعبادتی عمل ہے اور اگر عزاداری سے ان سیاسی مقاصد کو حاصل کیا جاسکے، تو تب عزاداری کی حقیقی شکل

نمودار ہو گی۔اہل بیت علیہم السلام نے واقعہ کربلا کے بعد کس انداز سے عزاداری کی ہے اور کن کن مقاصد کواس ذریعے سے حاصل کیا ہے۔آیئے اس حوالے سے تاریخ کاجائزہ لیتے ہیں:

## عقیلہ بنی ہاشم، حضرت زینب سلام اللہ علیہا کی عزاداری

واقعہ کربلا سے سب سے زیادہ جو ہستی متاثر ہوئی تھیں، وہ ثانی زہرا حضرت زینب سلام اللہ علیہا تھیں۔ واقعہ کربلا کے بعد حضرت زینب عالیہؑ اپنے بھائی اور عزیزوں کے سوگ میں مسلسل گریہ و نوحہ کناں تھیں اور کبھی بھی آپ کے آنسو خشک نہیں ہوئے تھے۔ جب اپنے بھائی کی یادگار، امام سجادؑ کی طرف متوجہ ہوتیں تو آپ کا غم و حزن مزید بڑھ جاتا تھا اور دلخراش مصائب آپ کے دل کو مزید غم واندوہ میں ڈبو دیتے تھے۔ نقل ہوا ہے کہ حضرت سیدہ زینب (س) اپنے بھائی کی شہادت کے بعد صرف دو سال زندہ رہیں اور اسی غم و مصیبت کی وجہ سے آپ کی وفات ہوئی ہے۔ کربلا کے بعد یہ قافلہ سالار بی بی اتنے مصائب دیکھنے کے باوجود جہاں خود عزادار اور گریہ کناں تھیں، وہاں دوسروں کو تسلی و تشفی بھی دیتی رہی ہیں۔ جب کربلا کالٹا ہوا قافلہ مقتل شہداء سے گذرا تو حضرت سجاد علیہ السلام نے جب اپنے مظلوم بابا اور عزیزوں کے بے گور و کفن لاشوں کو دیکھا تو آپ (ع) کا رنگ متغیر ہو گیا اور قریب تھا کہ آپ کی روح پرواز کر جاتی۔ جب ثانی زہرا (ع) نے یہ کیفیت دیکھی تو امام سجاد (ع) کو اپنی جانب متوجہ کیا اور فرمایا: (مالی أراک ماذا تجودبنفسک یابقیة جدی وأبی وأخوتی) یعنی: "اے میرے نانا، بابا اور بھائیوں کی باقیات! گویا میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ اپنے آپ کو گھائل کر رہے ہیں۔"

کربلا سے کوفہ اور پھر کوفہ سے شام تک جہاں موقع ملا، اس بی بی (ع) نے اپنے مظلوم بھائی کی مجلس پڑھی ہے اور خطبے دیے ہیں۔ ابن زیاد اور یزید ملعون کے بھرے درباروں میں مجلس بپا ہوئی اور بی بی نے اپنے مظلوم بھائی کے پیغام کو عام کیا ہے۔ حضرت زینب (ع) اپنے بھائی کی شہادت کے بعد مولا کی نائب خاص تھیں اور حلال و حرام کے احکام بیان فرماتی تھیں۔ چونکہ امام سجاد علیہ السلام بیماری کی وجہ سے سوال کرنے والوں کا جواب نہیں دے سکتے تھے اس لئے امام جعفر صادق علیہ السلام نے حضرت زینب (س) کے دامن چاک کرنے والے عمل کو، جو ثانی زہرا (س) نے اپنے بابا اور بھائی کی مصیبت پر کیا ہے، اس کے جواز کی سند کے طور پر بیان فرمایا ہے۔ (5)

ارباب مقاتل نے عزاداری اہل بیت کا ایک اور واقعہ بھی ذکر کیا ہے کہ جب کربلا کا یہ قافلہ کوفہ پہنچا تو حضرت زینب سلام اللہ علیہا کی نظر پڑی کہ نوک نیزہ پر بھائی کا سرِ اَطہر ہے تو آپ کے ہاتھ تو پابند رسن تھے، یہ منظر دیکھنے کے بعد بے ساختہ ام المصائب بی بی نے اپنی پیشانی اونٹ کی چوب محمل پر ماری۔ آپ کی پیشانی زخمی ہوئی اور خون جاری ہوگیا۔ اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ فرط غم وحزن میں بے ساختہ اس طرح کارد عمل ممکن ہوسکتا ہے۔

کامل میں شیخ بہائی نے نقل کیا ہے کہ حضرت ام کلثوم نے کسی کو یزید کے پاس بھیجا تاکہ وہ اجازت دے دے کہ ہم حضرت سیدالشہداء علیہ السلام کے لئے سوگواری وعزاداری برپا کرسکیں۔ یزید نے اجازت دی اور حکم دیا کہ اہل بیت کو دارالآمارہ میں لے جایا جائے تاکہ وہ وہاں عزاداری کریں۔ اہل بیت نے وہاں سات دن تک عزاداری کی۔ وہاں شام کی بہت ساری عورتیں بھی ساتھ شامل ہوجاتی تھیں اور عزاداری کرتی تھیں۔ مروان نے یزید کو اس عزاداری کی خبر دی اور کہا کہ شام کے لوگوں کی سوچ بدل رہی ہے اور اہل بیت کا شام میں رہنا بادشاہ کی حکومت کے لئے خطرناک ہے۔ لہٰذا ان کے سفر کے انتظامات کیے جائیں اور ان کو مدینہ بھیج دیا جائے۔ جس کے بعد یزید نے حکم دیا کہ ان کو مدینہ بھیجا جائے۔

معلوم ہوتا ہے کہ جہاں بھی اہل بیت کو موقع ملا ہے، صف ماتم بچھائی ہے، عزاداری کی ہے، حضرت سیدالشہداء اور آپ کے باوفا اصحاب کی مظلومیت کی داستان سنائی ہے اور حکومت وقت کے ظلم سے نقاب الٹی ہے۔ اس واقعہ اور دیگر واقعات سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ موسمی عزاداری نہیں ہونی چاہیے بلکہ آئمہ ہدیٰ علیہم السلام نے جب بھی موقع ملا، عزاداری کی ہے۔ لہٰذا موسمی عزادار حقیقی عزادار نہیں ہے اور نہ ایسی عزاداری اہل بیت کو مطلوب ہے۔ لہٰذا عزاداری صرف عشرہ محرم سے مخصوص نہیں ہے بلکہ اہل بیت کی عزاداری ہر وقت اور ہر زمانے میں رہی ہے اور اہل بیت کا پیغام بھی یہی ہے کہ یہ عزاداری ہر وقت رہنی چاہئے کیونکہ دین ابدی ہے، موسمی نہیں ہے اور عزاداری دین کے پیغام کا بہترین ذریعہ ہے۔ لہٰذا عزاداری بھی موسمی نہیں ہونی چاہئے۔ شام میں اہل بیت علیھم السلام کے سات روز تک عزاداری کرنے سے شام کے لوگوں کی سوچ بدل گئی اور یزید کو اپنی حکومت کا خطرہ دکھائی دینے لگا۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ آئمہ نے ایسی عزاداری کی ہے کہ جس سے حکومتیں ہل گئیں۔ ظالم گھبرا گئے

اور ڈر گئے۔ ایسی عزاداری نہیں کی کہ جو ظالموں کو تحفظ فراہم کرے اور حکام وقت عزاداری کی آڑ میں اپنے دنیاوی مفادات کو حاصل کریں۔ ایسی عزاداری نہ آئمہ نے کی ہے اور نہ ہی ان کا ہدف ہے۔

اہل حرم کا یہ لٹا ہوا قافلہ جب شام سے مدینہ لے جایا گیا تو بشیر بن جذلم کہتا ہے کہ جب ہم مدینہ کے قریب پہنچے تو امام سجاد علیہ السلام نے فرمایا: "اونٹوں سے سامان اتار دیا جائے اور قافلے کو روک دیا جائے۔" خیمے لگا دیے گئے اور اہل حرم خیام میں قیام پذیر ہوگئے۔ بشیر روایت کرتا ہے کہ امام (ع) نے مجھے بلایا اور فرمایا: "بشیر۔ خدا تیرے باپ جذلم پر رحمت کرے۔ اچھا شاعر تھا۔ کیا تو بھی شعر کہہ سکتا ہے؟" میں نے عرض کیا: "ہاں۔" فرزند رسول ﷺ امام سجاد علیہ السلام نے فرمایا: "تو ابھی مدینہ شہر میں جا اور حضرت ابی عبداللہ الحسین کی شہادت اور ہمارے مدینہ میں داخلے کی خبر مدینہ والوں کو دے دے۔ بشیر کہتا ہے کہ میں گھوڑے پر سوار ہوا اور جلدی سے مدینہ شہر میں پہنچا۔ مسجد نبوی ﷺ کی طرف پہنچا تو وہاں بلند آواز سے یہ اشعار پڑھے:

یا أهل يثرب لامقام لكم بها　　قتل الحسين وأدمعی مدرارُ

الجسم منه بكربلا مضرّج　　والرأس منه علىٰ القناة يدارُ

پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: "علی ابن الحسین علیہ السلام اپنی پھوپھیوں اور بہنوں کے ساتھ مدینہ سے باہر موجود ہیں۔" مورخین نے لکھا ہے کہ جب یہ خبر مدینہ والوں نے سنی تو سب لوگ گریہ کرتے ہوئے مدینہ سے باہر آگئے۔ بشیر کہتا ہے کہ اس دن گریے کا جو منظر تھا، وہ میں نے کہیں نہیں دیکھا۔

اب آیئے، اس بات میں غور و فکر کریں کہ آخر کیا ضرورت پیش آگئی کہ امام سجاد علیہ السلام نے اس مصیبت بھرے قافلے کو مدینہ سے باہر روک لیا؟ سوائے اس کے کہ کہ مولا چاہتے تھے کہ مدینہ والوں کو جمع کریں اور وہاں پر حضرت سیدالشہداء علیہ السلام کی مجلس بپا کریں۔ حضرت نے وہاں ایک دردانگیز خطبہ دیا اور عزاداری فرمائی۔ پھر یہ کہ حضرت نے بشیر کو جب مدینہ بھیجا تو پوچھا کہ کیا تو شعر کہہ سکتا ہے؟ یعنی امام علیہ السلام چاہتے تھے کہ اہل حرم کے مدینہ میں داخلے کی خبر مؤثر اور مجاہدانہ انداز سے پہنچائی جائے، لوگوں کے احساسات اور جذبات سے مثبت نتائج حاصل کئے جائیں اور اپنی مظلومیت کی داستان اور بنی امیہ کی سیاہ کاریاں بتائی جائیں۔

ہجرت کے آٹھویں سال جب پیغمبر ﷺ کے فرزند ابراہیم کا انتقال ہوا تو اسے قبرستان بقیع میں دفن کر دیا گیا۔ پیغمبر گرامی اسلام ﷺ نے اپنے اس فرزند کے فراق میں گریہ کیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ حضرت سے کسی نے کہا: "یا رسول اللہ ﷺ۔ آپ دوسروں کو تو گریہ سے منع کرتے ہیں اور خود روتے ہیں؟ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: (لیس هٰذا بکاء غضب انما هٰذا رحمة ومن لایرحم لایرحم) ''یہ غصے اور شکوے والا گریہ نہیں ہے بلکہ رأفت ورحمت والا گریہ ہے اور جو رحم نہ کرے، اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔(6) اور رسول خدا ﷺ کا یہی فرزند جب آغوش رسول ﷺ میں تھا اور اس کا وقت آخر تھا تو رسول خدا ﷺ نے اس بچے کو خطاب کر کے فرمایا: أنّا بک لمحزون تبکی العین ویدمع القلب ولانقول ما یسخط الرب (7)

جب رسول خدا ﷺ اپنے فرزند کے فراق میں گریہ کرتے رہے تو واقعہ کربلا کے دردناک اور المناک مصائب پر دل کیوں نہ روئے؟ اور انسان کے عواطف واحساسات اس ظلم پر کیوں نہ جوش میں آئیں؟ لہٰذا یہ گریہ اور رونا انبیاء کی سنت ہے، انسانیت کی نشانی ہے اور شرافت آدمیت ہے۔ اسی لئے تو حضرت آدم علیہ السلام اپنے بیٹے ہابیل کی مصیبت سے اتنے متاثر ہوئے کہ چالیس دن رات تک گریہ کیا۔

صاحب حیاۃ الامام الحسین نے لکھا ہے کہ اہل بیت کے مدینہ میں وارد ہونے کے بعد بنی ہاشم شہداء کربلا کے سوگ میں غمگیں ہوئے اور تین سال تک عزاداری اور ماتم کرتے رہے۔ رسول خدا ﷺ کے عمر رسیدہ اصحاب مسور بن مخزمہ، ابوہریرہ اور دوسرے اصحاب چھپ کر آتے تھے تاکہ بنی ہاشم کی عزاداری میں شریک ہوں اور بنی ہاشم کے ساتھ ہم صدا ہو کر حضرت سید الشہداءؑ کے سوگ میں گریہ کرتے تھے۔(8)

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے وقت آخر اپنے فرزند امام جعفر صادق علیہ السلام کو جہاں غسل وکفن کے حوالے سے وصیت فرمائی، وہاں خصوصیت کے ساتھ یہ وصیت بھی فرمائی ہے کہ میرے مال میں سے آٹھ سو درہم میری عزاداری کے لئے مخصوص کر دیئے جائیں اور دس سال تک حج کے موقع پر منیٰ کے میدان میں میرا غم منایا جائے۔ اس وصیت پر غور وفکر کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عزاداری اہل بیتؑ پر خرچ کرنا آئمہ کی آرزو تھی اور پھر حضرت نے منیٰ کے مقام کا کیوں انتخاب کیا؟ے اس کی وجہ یہی ہے

کہ کیونکہ اس تاریخ کو عام طور پر حجاج اس علاقہ میں رہتے ہیں اور پوری دنیا کے گوشے گوشے سے سارے عالم اسلام کا نمائندہ اجتماع اکٹھا ہوتا ہے۔ اس لئے اس مقام کا انتخاب فرمایا تاکہ اس طرح سے لوگوں کو حکام وقت کے مظالم اور آل محمد ﷺ کے فضائل و کمالات اور ان کی تعلیمات سے آگاہی ہوتی رہے۔
اس وصیت سے عزاداری کے اہتمام اور اس پر انفاق کے حوالے سے خصوصی تاکید بھی معلوم ہوتی ہے۔
نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ عزاداری کا اہتمام اور اس کو رواج دینا آئمہ علیہم السلام کی مرضی کے عین مطابق ہے اور انہوں نے خود یہ عمل کرکے دکھایا ہے۔ البتہ ایسی عزاداری جو آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی حقانیت اور حکام کے ظلم کو بیان کرے اور جس عزاداری کے سائے میں دین کا پیغام عام ہو، نہ کہ وہ عزاداری جس سے آئمہ اطہار کی توہین ہو، جو مقدسات کی توہین کا باعث بنے اور جس کو دیکھ کر لوگ آئمہ سے دور ہوں۔

## امام جعفر صادقؑ اور عزاداری

چھٹے امام حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اور امام ہشتم امام علی رضا علیہ السلام کا دور قدرے فرصت اور مہلت کا دور تھا۔ لہٰذا ان حضرات نے اس تبلیغی عنصر کو کافی فروغ دیا۔ فرش عزا بچھایا، لوگوں کو جمع کیا، شاعر یا خطیب سے ذکر مصائب کا مطالبہ کیا اور سامعین کو بلند آواز سے گریہ کرنے پر بھی زور دیا تاکہ ذکر مصائب عام ہو اور لوگ اس کی بنیادیں تلاش کرنے کی طرف متوجہ ہوں۔ ان دونوں اماموں نے اپنے دور میں عزاداری کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ عبداللہ بن سنان روایت کرتا ہے کہ میں عاشور کے دن امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں گیا۔ میں نے دیکھا کہ حضرت کا رنگ اترا ہوا ہے۔ آپ (ع) غم و اندوہ کی کیفیت میں تھے اور آنکھوں سے آنسو موتیوں کی طرح جاری تھے۔ میں نے آپ سے اس گریہ کا سبب پوچھا۔ آپ نے فرمایا: "کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اس دن ہمارے جد حسینؑ کو شہید کیا گیا۔" (9)
یہاں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے یوم وفات اور باقی آئمہ اطہار کے ایام شہادت کو اتنی عظیم مصیبت اور غم و حزن والا دن کیوں نہیں قرار دیا گیا اور ان حضرات کے ایام غم پر اتنا غم کیوں نہیں منایا جاتا؟ یہی سوال ایک صحابی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا: عبداللہ بن فضیل کہتا ہے کہ میں نے امام صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ عاشور کا دن اتنی مصیبت و غم کا دن قرار پایا لیکن پیغمبر اسلام ﷺ کا یوم وفات، مولائے کائنات، حضرت سیدہ زہرا (س) اور حضرت امام حسنؑ کے ایام

شہادت اتنی مصیبت کے دن کیوں نہیں قرار پائے؟امام علیہ السلام نے فرمایا:أن یوم الحسین اعظم مصیبةً من جمیع الأیام ......فکان ذهابُه'کذہاب جمیعهم(10) یعنی: "عاشور کادن اس لئے بڑی مصیبت کادن ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوئی توامیر المؤمنین موجود تھے، باقی افراد پنجتن وآل عبا موجود تھے مگرجب ہمارے جد حسین (ع) کی شہادت ہوئی تو گویا سب کی شہادت واقع ہوئی ہے اور پنجتن کی آخری نشانی حسین (ع) تھے۔"

بعض اوقات امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے صحابیوں کو مجالس عزاداری قائم کرنے کاحکم بھی دیتے تھے۔ آپ نے اپنے ایک صحابی فضیل کوفرمایا: " کیاتم مجالس برپا کرتے ہواور بحث وگفتگو کرتے ہو؟" جب فضیل نے مثبت جواب دیا توامام علیہ السلام نے فرمایا: "ان مجالس کومیں پسند کرتا ہوں" فأحیوا أمرنا رحم الله من أحییٰ أمرنا نیز آپ نے دعا بھی فرمائی ہے کہ خدارحم کرے اس شخص پر، جو ہمارے امر امامت وولایت کوزندہ رکھے۔(11)

لہٰذا آئمہ علیہم السلام نے مختلف اوقات میں اپنے صحابہ کو عزاداری کی اہمیت اوراس کو بپا کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔چنانچہ بعض اوقات کسی قصیدہ خواں یا مرثیہ خواں کومرثیہ پڑھنے کاحکم دیتے اور گریہ فرماتے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام ،ابوہارون مکفوف، مشہور مرثیہ خواں کوحکم دیتے کہ مرثیہ پڑھو۔ جب وہ مرثیہ پڑھتا تو دیکھا جاتا کہ امام علیہ السلام بہت گریہ فرمارہے ہیں۔ امام کے رونے کے ساتھ پردے کے پیچھے موجود خواتین بھی گریہ کرتیں۔اس طرح سے یہ صف ماتم بچھائی جاتی رہی۔

## امام رضا علیہ السلام اور معروف شاعر دعبل خزاعی

دعبل بن علی خزاعی، جو کہ درجہ اول کاشاعر تھااور جس کامقام فصاحت وبلاغت اور شعروادب، بیان سے بالاتر ہے، کہتا ہے کہ جب میں نے قصیدہ''مدارس آیات'' کو نظم کیاتو یہ چاہاکہ امام علی رضا علیہ السلام کی خدمت میں خراسان جاؤں اور یہ قصیدہ ان کے حضور پیش کروں۔امام مرو میں قیام پذیر تھے اور یہ آپ کی ولی عہدی کادور تھا۔ شیخ صدوق نے روایت کی ہے کہ دعبل مقام مرو میں امام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: "فرزندرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔میں نے آپ کے لئے ایک قصیدہ لکھا ہے اور قسم کھائی ہے کہ

آپ سے پہلے کسی کے سامنے نہیں پڑھوں گا۔ امام نے فرمایا: "لے آؤ۔"، مولا نے فرش عزا بچھوا دیا، خواتین کو پس پردہ طلب کیا اور پھر اس عظیم مداح اہل بیت نے قصیدہ پڑھا۔ جب اس نے یہ شعر پڑھا:

أریٰ فیئهم مقتسماً فی غیرهم　　　　وأیدیهم من فیئهم صفران

یعنی: "میں دیکھتا ہوں ان کا مال (فئی) غیروں میں تقسیم ہو رہا ہے اور ان کے ہاتھ اپنے مال (فئی) سے خالی ہیں۔''

دعبل کہتا ہے کہ حضرت گریہ کرنے لگے اور فرمایا: "اے خزاعی۔ تو سچ کہتا ہے۔" پھر دعبل نے ایک اور شعر پڑھا کہ ''جب ان پر ظلم ہوتا ہے تو وہ ظلم کرنے والوں کی طرف اپنی ہتھیلیاں بڑھاتے ہیں جو کہ بدلہ لینے سے بند ہیں۔'' دعبل کہتا ہے کہ امام نے اپنی ہتھیلی کو بند کیا اور فرمایا: "خدا کی قسم۔ بند ہیں۔" غرض امام علیہ السلام نے دعبل کے ہر شعر پر داد دی اور حوصلہ افزائی کی۔ جب دعبل نے آخری شعر پڑھا جو کہ آپ کے والد گرامی حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے بارے میں تھا تو امام نے فرمایا: "دعبل! میں تیرے اس قصیدے کے ساتھ دو بیت اور ملحق کر دوں تا کہ تیرا قصیدہ مکمل ہو جائے۔" پھر امام نے یہ شعر پڑھے:

وقبر بطوسٍ یالها من مصیبةٍ　　　　الحش علی الأحشاء باالزفرات

الیٰ الحشر حتیٰ یبعث الله قائماً　　　　یفرّج عنا الهم والکربات

''اور ایک قبر طوس میں ہے اور کتنی بڑی مصیبت ہے اس کی کہ جس نے اپنی گرم سانسوں سے انتڑیوں کو چھیل دیا۔ حشر کے دن تک کے لئے، یہاں تک کہ خدا قائم علیہ السلام کو مبعوث کرے گا جو ہمارے غم اور مصیبتوں کو دور کرے گا۔''

دعبل نے پوچھا: "مولا۔ یہ کس کی قبر ہے؟" آپ نے فرمایا: "یہ میری قبر ہوگی۔" تو معلوم ہوتا ہے کہ آئمہ ہدیٰ علیہم السلام ایسے مداحوں اور شعراء کا کلام سنتے تھے اور ان کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ جبکہ حقیقت میں مقصد اس ذکر کو زندہ رکھنا تھا۔ دعبل کے اس قصیدے کے بعد امام علیہ السلام نے دعبل کو ایک سو اشرفی کا انعام عطا فرمایا جس پر حضرت کا اسم گرامی کندہ تھا تا کہ واضح رہے کہ خدمت اہل بیت (ع) کا مطلب مفت کام کرنا نہیں ہے بلکہ خدمت کرنا امت کا کام ہے اور انعام دینا اہل بیت (ع) کی اپنی ذمہ داری ہے۔

حضرت امام رضا علیہ السلام نے روایت کی ہے کہ جب بھی ماہ محرم آتا تھا تو میرے والد کو خوشی میں ہنستے

ہوئے نہیں دیکھا جاتا بلکہ غم واندوہ کی کیفیت میں چلے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ عاشور کا دن آتا تھا تو اس دن آپ کا گریہ بڑھ جاتا تھا اور فرماتے تھے: هويوم الذى قتل فيه الحسين (12) اس کے علاوہ خود امام علیہ السلام بھی آغاز محرم کے ساتھ ہی سوگواری کا سلسلہ شروع کر دیتے تھے۔آپ نے محرم کے آغاز میں اپنے صحابی ابن شبیب کو فرمایا: یا بن الشبیب أن کنت باکیاً فابک علیٰ جدی الحسین یعنی: "اے ابن شبیب! اگر تجھے کسی بات پر رونا آئے تو میرے جد حسین (ع) پر گریہ کرنا۔ اس لئے کہ انہیں بھوکا پیاسا شہید کیا گیا ہے۔"

البتہ اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں ہے کہ عزاداری صرف عشرۂ محرم سے مخصوص ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ جیسے ہم مندرجہ بالا واقعات و روایات سے یہ نتیجہ نکال چکے ہیں کہ عزاداری موسمی کام نہیں ہے اور نہ ہی موسمی عزادار ہونا آئمہ ہدیٰ علیہم السلام کو مطلوب ہے۔اور اس موقف پر بہترین دلیل امام زمانہ علیہ السلام کے یہ جملے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''لاَندبنّک صبا حاً ومسائًا ولَابکینّکَ بَدَلَ ألدموع دَماً '' اے حسینؑ! میں صبح و شام آپ کی مصیبت پر روتا ہوں اور آپ پر آنسو کے بدلے خون گریہ کرتا ہوں۔(13)

آئمہ علیہم السلام کی طرف سے حضرت سیدالشھداء اور آپ کے باوفا اصحاب کی عزاداری پر بہت زیادہ تاکید ہوئی ہے اور دین کی بقاء اور اس کو انحرافات سے بچانے میں کوئی عمل عزاداری سے بڑھ کر نہیں ہے۔ عزاداری اسلامی ثقافت کو فروغ دینے کا بہترین ذریعہ ہے؛ جیسا کہ حکیم امت امام خمینی نے فرمایا: ''امام حسینؑ نے اسلام کو نجات دی اور خود قربان ہوگئے۔ جس عظیم ہستی نے اسلام کے لئے قربانی دی ہے، ہمیں ا س کے لئے ہر روز گریہ کرنا چاہئے اور اس مکتب کی حفاظت کے لئے ہمیں ہر روز مجلس بپا کرنی چاہئے۔ یہ محرم وصفر ہی ہے جس نے اسلام کو زندہ کیا ہے اور یہ حضرت سیدالشھداء علیہ السلام کی قربانی ہی ہے جس نے ہمارے لئے اسلام کو زندہ کیا ہے۔" آخر میں اہل بیت علیہم السلام کی عزاداری کے چند نمونے قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جس سے عزاداری اہل بیت کی روش اور انداز مزید واضح ہو جائے گا۔

## حضرت امّ البنینؑ کی عزاداری

حضرت عباسؑ علمدار کی مادر گرامی کو جب اپنے بیٹوں کی شہادت کی خبر ملی تو حضرت دن میں قبرستان

بقیع میں چلی جاتیں اور اپنے ان جگر گوشوں کی عزاداری اور نوحہ خوانی کرتیں۔ مدینہ کی عورتیں ان کے گرد جمع ہو جاتیں اور ان کے ساتھ ہم نوا ہو جاتی تھیں۔ اس طرح سے عزاداری کا ایک سلسلہ قبرستان بقیع میں جاری رہتا تھا۔ نقل کیا گیا ہے کہ حضرت کی عزاداری اتنی دردناک تھی کہ اہل بیت کا سب سے بڑا دشمن مروان بن حکم جب دن میں قبرستان سے گذرتا تھا اور حضرت کے نالہ وفریاد کو سنتا تھا تو بہت متاثر ہوتا تھا۔(14) بی بی کے اپنے جگر گوشوں کے سوگ میں چند اشعار درج ذیل ہیں:

یامن رأی العباس کرَّ علیٰ جماھیر النقد

وورائهُ من ابناء حیدر کلّ لیث ذولَبَد

أنبئتُ أَنَّ ابنی أُصیب برأسه مقطوع ید

وَیلی علیٰ شبلی آمال برأسه ضرب العمد

لوکان سیفک فی یدیک لَمَا دمیٰ منک أحد

لاتدعونّی ویک ام البنین تذکِّرینی بلیوث العرین

کانت بنون لی أدْعیٰ بهم والیوم اصبحتُ ولامن بنین

أربعة مثل نُسورِ الربیٰ قد واصلوا الموت بقطعِ الوتین

ترجمہ: ''اے وہ، جس نے عباس کو دیکھا ہوا ہے، کہ جب وہ مخالف گروہ پر حملہ آور ہوتے تھے تو ان کے پیچھے قوی شیروں کی مانند حیدرؑ کے بیٹے موجود ہوتے تھے۔ مجھے خبر دی گئی ہے کہ میرے بیٹے کا سر مجروح ہوا اور اس کے ہاتھ کٹ گئے۔ وائے ہو کہ میرے بیٹے کے سر پر گرز کا وار کیا گیا۔ (اے بیٹے۔) اگر تیری تلوار تیرے ہاتھ میں ہوتی تو کوئی بھی تیرے نزدیک نہ آسکتا۔ لوگو۔ اب مجھے ام البنینؑ نہ کہو کیونکہ اس طرح تم مجھے میرے شیر بیٹوں کی یاد دلاتے ہو۔ وہ میرے بیٹے ہی تھے کہ جن کے ذریعے مجھے پکارا جاتا تھا مگر آج میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ میرے چار بیٹے تیز پرواز والے عقابوں کی مانند گلے کٹوا کے موت سے جا ملے ہیں۔(15)

## حضرت ام رباب سلام اللہ علیہا کی عزاداری

حضرت ام ربابؑ، کہ جن کے والد امراؤ القیس کے قبیلے کا عرب کے بڑے قبیلے میں شمار ہوتا تھا اور حضرت سید الشہداء کے ہاں بھی حضرت رباب کا بڑا مقام تھا نیز ہمیشہ مولا کی نظر ان کے شامل حال

رہی تھی، سے روایت کی گئی ہے کہ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد حضرت ربابؑ جب تک زندہ رہیں، ہمیشہ گریہ کرتی رہیں۔ ابن اثیر کہتا ہے کہ حضرت ربابؑ جب اہل بیت کے قافلے کے ساتھ مدینے واپس آئیں تو قریش کے بزرگوں نے حضرت ربابؑ سے شادی کی خواہش کی۔ تب آپ نے جواب دیا کہ میں فرزند رسول ﷺ کے بعد کسی اور کے فرزند کے عقد میں نہیں آؤں گی۔ پھر ایک سال تک حضرت ربابؑ گریہ و عزاداری کرتی رہیں اور ایک سال تک سائے میں بھی نہیں بیٹھیں۔ آخر کار اسی غم کی وجہ سے آپ کی وفات ہو جاتی ہے۔(16) حضرت ربابؑ نے مولا امام حسینؑ کے لئے مندرجہ ذیل مرثیہ کہا ہے جو آپ کے غم واندوہ کی کیفیت کو بیان کرتا ہے:

أنّ الّذی کان نوراً یُستضاءُ به　　　بکربلا قتیل غیرمدفون
سبط النبی جزاک الله مصالحةً عنّا　　　وجنبّت خسران الموازین
قدْ کنتَ لی جبلاً صفراً ألوذُبه　　　وکنت تصحبنا بالرحم والدین
من للیتامیٰ ومن للسائلین ومن　　　یعنی ویاوی ألیه کلّ مسکین
والله لاابتغی صهراً بصهرکم　　　حتیٰ اغیّب بین الرمل والطین

## حضرت امام سجاد علیہ السلام کی عزاداری

امام سجاد علیہ السلام مدینہ سے مکہ، مکہ سے کربلا اور کربلا سے کوفہ وشام تک کے تمام حالات ومصائب کے عینی شاہد تھے۔ اس لئے اپنے بابا کی شہادت کے بعد چالیس سال برابر اپنے بابا کے غم میں روئے۔ جبکہ دن میں آپ روزہ رکھتے تھے اور رات کو خدا کی عبادت میں بسر کرتے تھے اور جب آپ کا خادم افطار کا سامان آپ کے پاس لاتا تو آپ شدت سے گریہ کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ میں کیسے پانی پیوں جبکہ میرے بابا کو پیاسا شہید کیا گیا ہے۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے حضرتؑ کی خدمت میں عرض کیا: "مولا۔ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ آپ کم گریہ فرمائیں؟" تو امام علیہ السلام نے فرمایا: وائے ہو تم پر۔ حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹے تھے اور ایک بیٹا گم ہوا تھا لیکن وہ اس کے فراق میں اتنا روئے کہ سر کے بال سفید ہو گئے، کمر جھک گئی اور آنکھوں کی بینائی جاتی رہی درحالیکہ میں نے اپنے اٹھارہ یوسفوں کو زمین پر ٹکڑے ٹکڑے ہوتا دیکھا ہے جبکہ ان کے بدن پر سر موجود نہیں تھے۔

یک پسرگم کرد یعقوب از فراقش کور شد

چون نگریم من که یک عالم پدر گم کرده ام

گذشتہ واقعات وروایات کی روشنی میں ہم حتمی طور پر یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اہل بیت علیہم السلام کی عزاداری کا انداز اور تاکید یہی تھی کہ عزاداری اور جلوس ومجالس کے اس سلسلے کو باقی رکھنا چاہئے۔ کوچہ و بازار میں جلوس عزاکابرپا کرنا حقیقت میں کربلاکے ابدی پیغام کوزندہ کرنا ہےاور یہ شعائراسلامی، اہل بیت کی حقانیت اوران کے مقدس ہدف کوبیان کرتے ہیں۔ عزاداری ایک سیاسی اور عبادتی عمل ہے۔ لہٰذا اگرعزاداری سے اسلام کے سیاسی مقاصد کو حاصل نہ کیاجاسکے توپھر یہ عزاداری کی حقیقی شکل نہیں ہوگی۔

*****

## حوالہ جات

---

1۔امالی شیخ صدوق، مجلس۲۹،حدیث ۳

2۔حیاۃالامام الحسین، ج۱، ص۲۷

3۔امالی شیخ صدوق،ج۵، مجلس۵۷

4۔امالی صدوق،ج٦، مجلس۲۸

5۔جواہرالکلام،ج۴، ص۳۰۷

6۔بحار،ج۲۲، ص۱۵۱۔ عیون الاخبارالرضا،ج۲،ص۱۱

7۔ صحیح بخاری،ج۱،ص۱۴۸

8۔حیاۃالامام الحسین،ج۳،ص۴۲۸

9۔سفینۃالبحار،ج۳،ص ۳۰۳

10۔وسائل الشیعہ،ج۱،ص ۳۹۴

11۔قرب الاسناد،ص۱۸

12۔امالی شیخ صدوق،ص۱۲۸

13۔ بحار الانوار ج ۹۸، ص ۳۲

14۔ حیاۃ الحسین، ۳، ص ۴۳۰

15۔ نفثۃ المصدر، ص ۲۶۳

16۔ کامل ابن اثیر، ج ۴، ص ۸۸

# امام حسین علیہ السلام اور تقیہ
## Imam Hussain (as) and *Taqiyyah*

سید رمیز الحسن موسوی

سوال علم کی کلید ہے۔ انسان کی خلقت کے آغاز سے ہی سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اگر سوال نہ ہوتا تو علم بھی نہ ہوتا۔ سوال ہی کے ذریعے علم وآگہی کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے، علم کے بند دروازے کھلتے ہیں اور انسان اپنے سوالات اور تجسّس کے ذریعے علم کی منزلیں طے کرتا ہے۔ کسی واقعے اور تاریخی حادثے کے بارے میں سوالات ہر متجسس ذہن میں ہوتے ہیں اور وہ تاریخ کے اس اہم ترین واقعے کی تمام جزئیات تک پہنچ کر اس واقعے میں حق و باطل قوتوں کی پہچان حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تاریخ اسلام بلکہ تاریخ انسانیت کا اہم ترین واقعہ، قیام کربلا ہے کہ جس میں سلسلہ نبوت ورسالت کے آخری تاجدار جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے اور آدم سے لے کر خاتم ﷺ کی نبوت کے امین اور نظام امامت وولایت کے تیسرے تاجدار نے حق و باطل کے اس معرکے میں شریعت کی پاسداری کے لئے اور دین اسلام کی حفاظت کے لئے ہر قسم کی قربانی دی، تمام مسلمانوں اور حق کے پیروکاروں کے لئے ظلم وستم کے خلاف قیام کرنے کا راستہ ہموار کر کیا اور مظلوموں کو جراءت عطا کی کہ وہ ظالموں کے ظلم واستبداد کے سامنے کبھی بھی سر نہ جھکائیں۔

قیام امام حسین در حقیقت پاسداری شریعت کا نام ہے اور شرعی اصولوں کی حکمرانی اور غیر شرعی زندگی کے خاتمے کا اعلان ہے۔ اس لئے میدان کربلا میں امام عالی مقام کا ہر قدم اور ہر عمل شریعت اسلامیہ کے احیاء کے لئے اُٹھ رہا تھا اور انسانی عقل ومنطق کے عین مطابق تھا۔ چنانچہ امامت وولایت کی معرفت رکھنے والا کوئی شخص سوچ بھی نہیں سکتا کہ امام حسین علیہ السلام نے کوئی قدم شریعت کے خلاف اٹھایا ہے اور اپنے جذبات واحساسات سے متاثر ہو کر یزید کے خلاف جنگ لڑی ہے۔ یہ بات وہی ذہن سوچ سکتا ہے جو امام عالی مقام کی عصمت اور ولایت کا قائل نہیں، امام علیہ السلام کو ایک عام لیڈر یا عرب سردار کے طور پر پہنچانتا ہے اور یزید وامام حسینؑ کے معرکے کو دو شہزادوں کی جنگ سمجھتا ہے لیکن امام حسینؑ کی

دین اسلام میں مقام و منزلت اور رسول اکرم ﷺ کی جانب سے امام علیہ السلام کی جو معرفت کرائی گئی ہے، اس سے آشنا انسان کبھی بھی اس طرح کی سوچ نہیں رکھ سکتا۔ البتہ سوال وشبہہ، خواہ معاند کی جانب سے ہو یا دوست کی جانب سے، اگر وہ حل ہو جائے اور علم کے دروازے کھول دے تو وہ علم کی کلید ہے۔ اس لئے یہاں قیام امام عالی مقام کے بارے میں ایک اہم سوال پیش کیا جارہا ہے اور تاریخ و عقل و شریعت کی روشنی میں اُس کا جواب تلاش کیا جائے گا تاکہ معرفت امام میں اضافہ ہوسکے اور قیام امام کے مقاصد سے آگاہی حاصل کی جاسکے۔

وہ سوال یہ ہے کہ اگر ہم تمام انبیاء اور اولیاء اور معصومین علیہم السلام کی جہد مسلسل پر مشتمل زندگی کو دیکھیں تو ہمیں ایک چیز بہت واضح نظر آتی ہے اور وہ خطرات کے مقابلے میں تقیہ کی حکمت عملی ہے کہ جو شریعت میں حکم ثانوی کے طور پر جائز قرار دی گئی ہے۔ انبیاء اور ائمہ اطہار کی سیرت اور تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ ان ذوات مقدسہ نے ضرورت کے وقت اس حکمت عملی سے استفادہ کیا ہے اور اپنے پیروکاروں کو بھی تقیہ کا حکم دیا ہے۔ اگر تقیہ ایک شرعی رخصت ہے اور اس کا جواز روایات میں موجود ہے تو سیدالشدا علیہ السلام نے تقیہ کا راستہ کیوں نہیں اختیار کیا ؟اور اس شرعی رخصت سے استفادہ کرتے ہوئے عالم اسلام کو کربلا جیسے افسوس ناک واقعہ سے کیوں نہیں بچایا ؟کیا امام حسین (ع) تقیہ نہیں کر سکتے تھے یا وہ تقیہ کے قائل نہیں تھے ؟ یہ وہ سوالات ہیں کہ جو دینی معرفت سے عاری اذہان میں پیدا ہو سکتے ہیں ۔اس سوال کا جواب تلاش کرنے سے پہلے خود شریعت میں تقیہ کے مفہوم کو سمجھنا ضروری ہے۔ لہٰذا تمہید کے طور پر تقیہ کے بارے میں چند ضروری باتیں یہاں پیش کی جاتی ہیں اور پھر ان کی روشنی میں معرکہ کربلا میں امام حسینؑ کے تقیہ نہ کرنے کی وجوہات پیش کی جائیں گی۔

## تقیہ کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم

سب سے پہلے تقیہ کا لغوی اور اصطلاحی معنیٰ بیان کیا جاتا ہے۔ لغت میں تقیہ مادہ ''وَقَى يَقِي'' اور ''اِتَّقَى، يَتَّقِي'' سے مصدر ہے۔ (1) بعض نے اسے اسمِ مصدر کہا ہے۔ (2) یہاں ''واو''، ''تاء'' میں بدل گیا ہے۔ اس مادہ کے تحت جو بھی کلمات آئے ہیں، انکا معنی، حفاظت کرنا، بچانا، پرہیز کرنا اور امور کی اصلاح کرنا ہے۔ قرآن کریم میں بھی ''وقی'' حفاظت اور بچانے کے معنی میں آیا ہے : فَوَقٰهُ اللهُ سَيِّاٰتِ مَا

مَكَرُوْا (3) یعنی: خداوند متعال نے اس (موسیٰ) کو ان برائیوں سے بچایا (کہ جو آل فرعون نے اس کے بارے میں سوچ رکھی تھیں)۔ تُقاۃ، تقیّۃ، تقویٰ و اتّقاء، سب ایک ہی (مادہ سے) ہیں۔ اسی لئے بعض قرآنی قرائتوں کے مطابق آیہ مبارکہ :اِلَّآ اَنۡ تَتَّقُوۡا مِنۡهُمۡ تُقٰىةً (4) میں "تُقٰاۃً" کی جگہ ''تقیّۃ'' پڑھا گیا ہے۔ (5) تقیہ کا اصطلاحی معنی بیان کرنے کیلئے بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں۔ ان میں سے اکثر تعریفات ''جامع افراد اور مانع اغیار'' نہیں، کیونکہ ان میں سے کوئی بھی تقیہ کی حقیقی تعریف نہیں بلکہ ''شرح الاسمی'' تعریف ہے۔ لہٰذا ان پر جامع ومانع تعریف نہ ہونے کا اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں بطور نمونہ بعض علماء سے منقول تقیہ کی چند تعریفیں نقل کی جاتی ہیں:

۱۔ شیخ مفید تقیہ کا اصطلاحی معنیٰ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (التقیّة کتمان الحق و ستر الاعتقاد فیه ومکاتمة المخالفین وترک مظاهرتهم بما یعقب ضرراً فی الدّین و الدّنیا) (6) یعنی: ''حق کو پوشیدہ رکھنا اور عقیدہ حقہ کو مخالفین سے چھپانا اور جن چیزوں کے اظہار سے دینی ودنیوی نقصان کا اندیشہ ہو، ان کو ظاہر کرنے سے پرہیز کرنا، تقیہ کہلاتا ہے۔''

۲۔ شیخ مرتضیٰ انصاری فرماتے ہیں: (والمراد هنا التحفظ عن ضرر الغیر بموافقته فی قول او فعل مخالف للحق) یعنی: ''یہاں تقیہ سے مراد یہ ہے کہ دوسروں کے مخالفِ حق، قول وفعل کے ساتھ موافقت کرتے ہوئے ان کی طرف سے (متوقع) ضرر ونقصان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا۔'' (7)

۳۔ علامہ طبرسی لکھتے ہیں: (وَالتَقِیَّةُ الاِظهٰارُ بِاللِّسٰانِ خِلاٰفُ ما یَنطَوی عَلَیهِ القَلبُ لِلخوفِ عَلٰی النَفسِ) یعنی: ''اپنی جان کے خوف سے جو کچھ دل میں ہو، اس کے خلاف زبان سے اظہار کرنے کو تقیہ کہتے ہیں۔'' (8)

۴۔ شیخ طوسی تقیہ کی اصطلاح کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (التقیّةُ: الاظهار باللسان خلاف ما ینطوی علیه القلب للخوف علی النفس اذا کان ما ببطنه هو الحق) یعنی: ''اپنی جان کے خوف سے جو کچھ دل میں ہو، اس کے خلاف اظہار کرنے کا نام تقیہ ہے؛ البتہ اس شرط کے ساتھ کہ جو دل میں ہو، وہ حق بات ہو (نہ کہ خلافِ حق)۔'' (9)

۵۔آیت اللہ بروجردی لکھتے ہیں:بِحِفظِ الشّخصِ عقیدَتَهُ مِن جِهة حِفظِ الامرِ الَمهَمّ یعنی: "کسی شخص کااپنے عقیدے(اور نظریے) کو کسی اہم ونہایت ضروری امر کی خاطر چھپانا(محفوظ رکھنا) تقیہ کہلاتا ہے۔" (10)

یہاں ہم نے علماء، فقہاء اور مفسرین میں سے چند برجستہ شخصیات کے اقوال نقل کئے ہیں کہ جنہوں نے اپنے اپنے الفاظ میں تقیہ کی تعریف کی ہے اور اس کا اصطلاحی معنی بیان کیا ہے۔مذکورہ تعریفوں میں سے بعض کادائرہ وسیع ہے اور بعض کادائرہ تنگ ہے اور بہت سے ایسے اقوال وافعال کو شامل نہیں جو تقیہ کامفہوم اداکرتے ہیں۔مثلاًجس تعریف میں فقط باطنی معتقدات کے برخلاف زبانی اظہار کو تقیہ کہاگیاہے، وہ ان افعال کو شامل نہیں کہ جوانسان اپنے اعضائے جوارح سے باطنی اعتقاد کے خلاف انجام دیتاہے، جیسے نماز میں تقیہ، کہ جوزبان کے علاوہ انسانی اعضاء وجوارح کے ذریعے اظہار عمل کا نتیجہ ہے۔لہٰذااس اعتراض سے بچنے کیلئے ہم اس تعریف کووسعت دیتے ہوئے کہہ سکتے ہیں: (التقیّة هی الاظهار باللسان او بسائر الاعضاء) کیونکہ تقیہ کے اکثر موارد ایسے اعمال میں پیش آتے ہیں کہ جوانسانی اعضاء وجوارح سے انجام پاتے ہیں۔

ان تعریفوں میں سے بعض نے فقط ''خوف علی النفس'' کی قید لگائی ہے، لیکن ضروری نہیں کہ تقیہ فقط جان کے تحفظ ہی کے لئے انجام پائے، بلکہ عزت وناموس ،مال ودولت اوردینی وسیاسی اوراجتماعی مصلحتوں کی خاطر بھی تقیہ کیاجاتاہے۔جیساکہ بہت سی روایات واحادیث میں مذکورہ مصلحتوں کی خاطر بھی تقیہ کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔البتہ اجتماعی ودینی اور سیاسی مصلحتوں کو''اولویت''کے عنوان سے اس تعریف میں داخل کیاجاسکتاہے۔یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''جب تقیہ جان ونفس کی خاطر ضروری ہے توعام مؤمنین کو ضرر ونقصان سے بچانے اوراسلامی معاشرے وحکومت کی مصلحتوں کی خاطر بطریق اولیٰ لازمی ہوگا''۔اس طرح عزت وناموس اورمال ودولت کو بھی اس تعریف میں داخل کیاجاسکتاہے اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ: ''قدرومنزلت اورحرمت کے لحاظ سے مؤمن کی عزت وآبرواورمال ودولت، اس کے نفس کی مانندہے۔جیساکہ حدیث میں آیاہے:قال النبی(ص): حرمة مال المسلم کحرمة دمه''مسلمان کے مال کی حرمت ،اس کے خون کی حرمت کی مانند ہے۔'' (11) البتہ ان تمام اصطلاحی

معنوں اور تعریفات کو مد نظر رکھتے ہوئے بعض محققین نے ایک جامع تعریف کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ایک تعریف میں تقیہ کا یہ مفہوم پیش کیا گیا ہے:

''بعض احکام شرع کو دینی مصلحتوں اور دوسرے اسلامی فرقوں اور مذاہب کے ساتھ رواداری برتنے کی خاطر ترک کرنا تقیہ کہلاتا ہے،اس شرط کے ساتھ (کہ اس ترک کرنے میں) کوئی عقلی غرض موجود ہو یا جان ومال وعزت وناموس کا خوف ہو۔'' (12)

## چند نکات

تقیہ کے اصطلاحی مفہوم سے متعلق مذکورہ بالا تمام تعریفوں کے مطالعے سے چند نکات سامنے آتے ہیں جن کی طرف توجہ کرنے سے ہمیں تقیہ کا ایک جامع مفہوم مل سکتا ہے۔وہ نکات یہ ہیں:

۱۔ عقیدہ حقہ کو مخفی اور پوشیدہ رکھنا تقیہ کا ایک اہم رکن ہے۔

۲۔ مخالفین حق کے ساتھ موافقت وہم آہنگی کرنا، تقیہ کا ایک دوسرا رکن ہے۔

۳۔ حق کا یہ اخفاء اور باطل کا اظہار کرنا یا تو جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کیلئے ہوتا ہے یا دینی واجتماعی وسیاسی مصلحتوں اور عام مؤمنین کو ضرر وزیاں سے محفوظ رکھنے کی خاطر انجام دیا جاتا ہے۔پس کسی دینی عقیدے کو ضرر ونقصان کے خوف سے مخفی کرنے کا نام اسی وقت تقیہ ہوگا، جب وہ حق پر مبنی ہوگا۔خلاف حق نظریے وعقیدے کو مخفی کرنا تقیہ نہیں کہلاتا۔

۴۔ تقیہ کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک سلبی پہلو اور دوسرا ایجابی پہلو۔حق کا کتمان اور حق کو پوشیدہ رکھنا، سلبی پہلو اور مخالفین حق کے ساتھ موافقت وقدم بہ قدم چلنا، تقیہ کا ایجابی پہلو ہے۔ان دونوں پہلوؤں کی علت ایک ہی ہے اور وہ علت ضرر ونقصان سے بچنا ہے۔ خواہ وہ ضرر جانی ہو یا مالی، عزت وناموس کا ضرر ہو یا اجتماعی وسیاسی۔

۵۔ تقیہ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اپنی قوت کو دشمن کے مقابلے کے لئے محفوظ رکھ کر اسے بلا مقصد ضائع ہونے سے بچایا جائے تاکہ دینی واجتماعی اہداف اور مصلحت عامہ کی خاطر اس ذخیرہ شدہ قوت سے بر وقت استفادہ کیا جاسکے۔

۶۔آیت اللہ بروجردی کی بیان کردہ تعریف میں کسی اہم وضروری امر کی خاطر اپنے عقیدے ونظریے

کے کتمان کو تقیہ کہا گیا ہے۔اس تعریف میں جو چیز مد نظر رکھی گئی ہے، وہ تقیہ کا فلسفہ ہے۔ یعنی ایک طویل جدوجہد کیلئے آمادہ ہونا اور اپنی قوت کو اجتماعی زندگی کے اہم ترین مقاصد کیلئے استعمال کرنا، تقیہ کہلاتا ہے۔ پس تقیہ ایک ایسی تدبیر اور حکمت عملی ہے جس کے ذریعے انسان کو نظم وضبط کیساتھ نظریاتی جدوجہد اور جہاد کیلئے تیار کیا جاتا ہے۔

۷۔ تقیہ ہر اس قوم وجماعت کیلئے ایک ڈھال وسپر ہے جس پر اکثریت کا غلبہ ہو اور وہ اکثریت، اس اقلیت کو اظہار عقیدہ اور اس کے مطابق عمل کرنے کی اجازت نہ دیتی ہو، تو وہ اقلیت عقلی وشرعی رخصت سے استفادہ کرتے ہوئے فطرت انسانی کے عین مطابق اہم ترین مقاصد کی خاطر تقیہ کا سہارا لیتی ہے۔

## تقیہ، حکم اوّلی یا حکم ثانوی

اصول فقہ میں احکام شرعیہ کو چند قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ منجملہ احکام کو احکام اولیہ اور احکام ثانویہ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہاں ان احکام کی تفصیلی بحث مقصود نہیں ہے بلکہ فقط موضوع کی مناسبت سے ان احکام کی طرف ایک اشارہ کرتے ہوئے یہ دیکھنا مقصود ہے کہ آیا تقیہ حکم اولیٰ ہے یا حکم ثانوی؟ ہم سادہ الفاظ میں حکم اولیٰ وحکم ثانوی کی وہ تعریف نقل کرتے ہیں جو فقہاکے درمیان مشہور ہے:

**حکم اولیٰ:** ایسا حکم کہ جو افعال وذوات کے عناوین اولیہ کے لحاظ سے ان پر حمل ہوتا ہے۔ جیسے صبح کی نماز کا واجب ہونا، شراب کا حرام ہونا وغیرہ۔ **حکم ثانوی:** ایسا حکم کہ جو کسی موضوع پر اضطرار، اکراہ اور دوسرے عارضی عناوین کو مد نظر رکھتے ہوئے حمل ہوتا ہے۔ جیسے ماہ رمضان المبارک میں بیمار کے لیے افطار کا جائز ہونا یا بیمار کے لیے بیٹھ کر نماز پڑھنے کا جائز ہونا۔ (13) یادرہے کہ اسے حکم ثانوی اس لیے کہتے ہیں کیونکہ یہ حکم اولی کے طول میں واقع ہوتا ہے۔ یعنی پہلے حکم اولی ہے اور اگر اس پر عمل نہ کیا جاسکے تو حکم ثانوی جاری ہوگا۔

## تقیہ اور دوسرے احکام ثانویہ میں ارتباط

گو کہ تقیہ خود حکم ثانوی ہے لیکن تقیہ کا بعض دوسرے احکام ثانویہ کے ساتھ گہرا ربط موجود ہے۔(14) چونکہ بہت سے موارد میں تقیہ کے جواز کا معیار اضطرار ہے۔ جیسا کہ روایت میں ہے: التقیۃ فی کل شیئٍ یضطر الیہ ابن آدم (15) '' تقیہ ہر اس چیز میں ہے کہ جس میں انسان مضطر ہو جائے''۔اسی طرح بعض

مقامات پر تقیہ عسر وحرج کی وجہ سے بھی جائز ہو جاتا ہے۔ بعض موارد میں "اکراہ" کو بھی تقیہ کے جواز کا باعث قرار دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ تقیہ کی قرآنی ادلہ میں سے سورہ نحل کی آیت ۱۰۶ میں تقیہ کی علت اکراہ کو قرار دیا گیا ہے۔

## تقیہ کی ایک دوسری تقسیم:

فقہائے امامیہ نے تقیہ کے احکام تکلیفی بیان کرتے ہوئے اسے بھی دوسرے افعال کی مانند احکام خمسہ میں تقسیم کیا ہے چنانچہ شہید اول اور استاد الفقہاء شیخ انصاری نے تقیہ کے احکام خمسہ اس ترتیب سے بیان فرمائے ہیں:

۱۔ تقیہ واجب: جب دفع ضرر بالفعل واجب ہو (16) اور انسان جان لے کہ تقیہ نہ کرنے کی وجہ سے اسے یا کسی مؤمن کو ضرر پہنچے گا، تو تقیہ واجب ہوگا۔ (17) انسان کسی ایسے ماحول میں زندگی گزار رہا ہو کہ جہاں اظہار اسلام کرنے یا اہل بیت اطہار (ع) سے اظہار مودت کرنے سے جان کا خطرہ ہو یا کسی حاکم جائر کے سامنے کوئی بات کہنے سے کسی مؤمن کی جان خطرے میں پڑ جائے، تو یہاں تقیہ اور کتمان حق واجب ہو جاتا ہے۔

۲۔ تقیہ مستحب: جب تقیہ نہ کرنے کی وجہ سے طرف مقابل کی جانب سے تدریجاً ضرر پہنچنے کا احتمال ہو تو تقیہ مستحب ہے۔ دوسرے الفاظ میں اپنے آپ کو خطرے سے دور رکھنے کے لیے تقیہ کرنا مستحب ہے۔ مثلاً مخالفین کے ساتھ ان کی اکثریت کے علاقے میں زندگی گزارنے کے باوجود رواداری نہ برتنا، تدریجی طور پر ان میں نفرت پیدا ہونے کا سبب بنتا ہے جس سے مستقبل میں خطرات پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہاں تقیہ کرنا مستحب ہوگا یا کسی مستحب امر میں تقیہ کیا جائے جیسے تسبیحات حضرت زہرا (س) کی ترتیب میں تقیہ کرنا یا اذان کی بعض فصول (مثلاً حی علی خیر العمل) میں تقیہ کرنا وغیرہ۔ (18)

۳۔ تقیہ مکروہ: جہاں تقیہ نہ کرنا اور ضرر برداشت کرنا، تقیہ کرنے سے بہتر ہو۔ مثلاً کسی قوم کے رئیس و سردار کے تقیہ کرنے کی وجہ سے اس کے پیروکاروں میں شکوک و شبہات پیدا ہونے لگیں اور وہ گمان کریں کہ حکم واقعی ویسے ہی ہے جیسے اس نے انجام دیا ہے۔ تو یہاں لوگوں کو گمراہی و سرگردانی سے بچانے کے لئے تقیہ نہ کرنا بہتر ہے۔

۴۔ تقیہ حرام: جب تقیہ کرنے کی وجہ سے کسی مؤمن کا خون بہ جانے کا اندیشہ ہو تو وہاں تقیہ حرام ہے(۷) البتہ تقیہ حرام کی تفصیل ''مستثنیات تقیہ'' میں پیش کی جائیں گی۔

۵۔ تقیہ مباح: جب تقیہ کرنے اور نہ کرنے میں کوئی فرق نہ ہو اور انسان دونوں کے انجام دینے میں مخیّر ہو۔ مثلاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں جب ''مسیلمۃ کذاب'' نے نبوت کا دعویٰ کیا تو دو مسلمانوں کو اس کے ساتھیوں نے پکڑ لیا اور ان سے کہا کہ وہ مسیلمۃ کذاب کے نبی ہونے کی گواہی دیں۔ ان دونوں میں سے ایک نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے نبی ہیں اور مسیلمۃ جھوٹا ہے۔ مسیلمہ نے اسے قتل کر دیا۔ دوسرے مسلمان نے مسیلمہ کے کہنے پر عمل کیا اور اس کے نبی ہونے کی گواہی دے دی۔ مسیلمہ نے اسے آزاد کر دیا۔ جب یہ خبر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''پہلا شخص کہ جس نے اقرار نہیں کیا اور قتل ہو گیا، وہ بہشت کی طرف روانہ ہو گیا ہے اور دوسرا شخص کہ جس نے اپنے فریضہ پر عمل کیا ہے، تقیہ اختیار کر کے محفوظ ہو گیا ہے۔ لہٰذا ہر دو ماجور ہیں''۔ یعنی تقیہ مباح کی صورت میں تقیہ کرنے والا اور نہ کرنے والا ہر دو ماجور و مثاب ہوتے ہیں۔(19)

## امام خمینی کے نزدیک تقیہ کی اقسام:

تقیہ کو مختلف لحاظ سے چند اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جتنے بھی محققین اور علماء نے تقیہ کے بارے میں کچھ لکھا ہے، ان میں سے کسی نے بھی تقیہ کی اقسام اتنی باریک بینی سے بیان نہیں کیں جتنی دقت اور باریک بینی سے امام خمینی علیہ الرحمہ نے بیان کی ہیں۔ امام امت نے تقیہ کو مختلف لحاظ سے تقسیم کیا ہے۔ جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

### (الف) تقیہ کی ذاتی تقسیم:

تقیہ ذاتی طور پر چند قسموں میں تقسیم ہوتا ہے۔ اسے ہم اسباب کے لحاظ سے بھی تقیہ کی تقسیم کہہ سکتے ہیں۔ یعنی تقیہ کرنے کا سبب کیا ہے۔

۱۔ تقیہ خوفیہ: کسی خوف اور خطرے کے سبب تقیہ کرنا، تقیہ خوفیہ کہلاتا ہے۔ اسے ہم تقیہ اکراہیہ بھی کہہ سکتے ہیں، یعنی جبر و اکراہ کی وجہ سے تقیہ کرنا۔ یہاں خوف و خطرہ بھی تین طرح کا ہو سکتا ہے۔

(۱) اپنی جان ومال یا عزت وآبرو کے خطرے وخوف کی وجہ سے تقیہ کرنا۔ (۲) دوسرے مؤمنین کو ضرر پہنچنے کے خطرے وخوف کے سبب تقیہ کرنا۔ (۳) دنیائے اسلام یا اسلامی معاشرے کو (ناقابل تلافی) ضرر و نقصان پہنچنے کے خطرے وخوف کے سبب تقیہ کرنا۔

خوف وخطر یا جبر اکراہ کی بناء پر تقیہ کرنے کی طرف آیات وروایات میں بھی واضح اشارہ ملتا ہے۔ چنانچہ سورہ آل عمران کی آیت ۲۸ ''لَایَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُون الخ'' تقیہ خوفیہ ہی کی طرف ناظر ہے۔ اسی طرح سورہ نحل کی آیت ۱۰۶: مَنْ كَفَرَ بِاللهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ الخ'' بھی جبر واکراہ کی بناء پر تقیہ کرنے کے جواز پر دلالت کر رہی ہے۔ بعض روایات واحادیث میں بھی جان ومال اور عزت وآبرو کے خوف کی وجہ سے تقیہ کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ جیسا کہ امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی ایک حدیث گذشتہ صفحات میں نقل کی گئی ہے جس میں آپ فرماتے ہیں:

'' تقیہ مؤمن کے بہترین اعمال میں سے ہے جس کے ذریعے وہ اپنے آپ کو اور اپنے دینی بھائیوں کو ظالموں سے بچاتا ہے...''(20) اسی طرح دوسری بہت سی روایات میں بھی تقیہ کا سبب خوف وخطر کو قرار دیا گیا ہے اور اس کی بناء پر تقیہ کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ چند روایات ادلہ تقیہ کے ذیل میں نقل کی گئی ہیں۔

تقیہ خوفیہ کی تیسری قسم وہ تقیہ ہے کہ جو دنیائے اسلام واسلامی معاشرے کو ناقابل تلافی نقصان وضرر سے بچانے کی خاطر کیا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ تقیہ فقط جان ومال کی حفاظت اور خطرے سے بچنے ہی کے لیے نہیں ہوتا بلکہ ان چیزوں سے بھی زیادہ اہم مقصد کے لیے تقیہ کیا جاتا ہے اور وہ اہم مقصد دین اسلام اور مذہب حقہ کی حفاظت اور اسے دشمنوں کے خطرے سے محفوظ رکھنا ہے۔

امام خمینی تقیہ کی اس قسم کو اذاعہ وافشاء کے مقابلے میں بیان کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

ومنها: ما تكون واجبة لنفسها،وهی ما تكون مقابلة للاذاعة،فتكون بمعنى التحفظ عن فشاء المذهب وعن فشاء سرّاهل البيت۔ فيظهر من كثير من الروايات التقية التی بالغ الائمة(ع) فی شانها،هی هذه التقية فنفس اخفاء الحق فی دولة الباطل واجب وتكون المصلحة فيه جهات سياسية دينية ولولا التقية لصار المذهب فی معرض الزوال والانقراض (21)

یعنی: " تقیہ کی ایک قسم وہ ہے کہ جو ذاتاً واجب ہے اور یہ وہ تقیہ ہے جو اذاعہ وافشا کے مقابلے میں ہے۔ پس اس کا معنی مذہب حقہ کو افشاء ہونے سے محفوظ رکھنا اور اہل بیت کے اسرار کو آشکار نہ کرنا ہے۔ بہت سی روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آئمہ اہل بیت جس تقیہ کی تاکید فرماتے تھے، وہ یہی تقیہ تھا۔ بنابریں، باطل حکومت کے دوران حق کو پنہاں رکھنا واجب ہے اور اس اخفاء و پوشیدگیء حق کی مصلحت اس کا دینی وسیاسی پہلو ہے۔ اگر تقیہ نہ ہوتا تو مذہب حقہ زوال وانقراض کے خطرے سے دوچار ہو جاتا۔"

پس جان ومال اور عزت وآبرو کے علاوہ دین اسلام اور مذہب حقہ کی حفاظت جیسے اہم مقصد کی خاطر تقیہ کرنا واجب ہے۔ اگر دین اور مذہب خطرے سے دوچار ہو جائے اور ہمارا تقیہ کرنا اسے بچا سکتا ہو تو تقیہ کرنا واجب ہو جاتا ہے جیسا کہ سیرت آئمہ اطہار خصوصاً امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی مقدس زندگی اس کی شاہد ہے کہ آپ نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ دین اسلام اور مذہب حقہ کی مصلحت وحفاظت کی خاطر تقیہ میں گزارا۔

## مداراتی تقیہ

دین اسلام میں دوسروں کے ساتھ صلح وآشتی اور رواداری برتنے کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ مداراتی تقیہ یہ ہے کہ وحدت مسلمین کی خاطر مخالف مذہب مسلمان بھائیوں کے ساتھ صلح وآشتی اور مدارا کرتے ہوئے ایسا کوئی عمل انجام نہ دینا جو ان کی دل شکنی اور نفرت کا باعث بنے، بلکہ چھوٹے موٹے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر دوسرے مسلمانوں کی محبت ومودّت حاصل کرنا چاہیے۔ تقیہ مداراتیہ میں ضرر ونقصان کا خوف نہیں ہوتا بلکہ فقط مسلمانوں کے اتحاد اور باہمی اخوت ومحبت کو برقرار رکھنا ہی اس قسم کے تقیہ کا مقصد ہے۔ تقیہ مداراتیہ کے بارے میں بہت سی احادیث وروایات ملتی ہیں اور آئمہ طاہرین کی طرف سے اس سلسلے میں خصوصی تعلیمات بھی موجود ہیں۔ چند روایات ذیل میں نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔عن عبد اللهبن سنان،عن ابی عبد اللهعلیه السلام قال: قال رسول الله صلی الله علیه وآله: امرنی ربی بمداراة الناس کما امرنی بأداء الفرائض (22) یعنی:

"عبداللہ بن سنان امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ رسول خداﷺ نے فرمایا: میرے پروردگار نے مجھے جیسے واجبات وفرائض کی انجام دہی کا حکم دیا ہے، ویسے ہی لوگوں کے ساتھ رواداری اور صلح وآشتی برتنے کا حکم بھی دیا ہے۔"

۲ ۔ عن بی عبد الله علیه السلام قال: قال رسول الله صلی الله علیه وآله: مداراة الناس نصف الایمان والرفق بهم نصف العیش (23) یعنی: "امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ رسول خداﷺ نے فرمایا: لوگوں کے ساتھ صلح و آشتی ورواداری نصف ایمان ہے اور ان سے نرمی و مہربانی سے پیش آنا نصف زندگی ہے''۔

۳۔عن ابی عبد الله علیه السلام فی رِسٰالَتِه اِلیٰ اصحٰابه قال: وَعَکَیکُم بِمُجٰاملةِ اهل البٰاطل...... (24) یعنی: "حضرت جعفر صادق علیہ السلام اپنے اصحاب کے نام ایک خط میں فرماتے ہیں: تمہارے لیے اہل باطل کے ساتھ اچھارویہ وخوش کلامی ضروری ہے۔"

آئمہ معصومین علیہ السلام کی طرف سے مخالف مذہب کے دینی بھائیوں اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ حسن معاشرت اور رواداری وآشتی کی اس قدر تاکید کا فلسفہ درحقیقت قرآن کے اس فرمان کی تعمیل ہے کہ جس میں خداوندمتعال مسلمانوں کو تفرقہ سے بچنے کا حکم دیتا ہے۔ چنانچہ خداوند فرماتا ہے: وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللہِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللہِ عَلَیۡکُمۡ اِذۡ کُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِہٖۤ اِخۡوَانًا(25) یعنی: "تم سب لوگ اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور متفرق نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو جو تم پر ہے، یاد کرتے رہو جبکہ تم دشمن تھے۔ پس اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس نعمت کے طفیل بھائی بھائی ہوگئے۔"

## متقی (تقیہ کنندہ) کے لحاظ سے تقیہ کی اقسام

ا۔عام انسانوں کا تقیہ: معاشرے کے عام لوگوں کا تقیہ کرنا کہ جو کسی مقام وعہدے پر فائز نہیں۔

۲۔ معاشرے کے دینی و غیر دینی رہنماؤں کا تقیہ: ان لوگوں کا تقیہ کرنا کہ جو دینی یا دنیوی لحاظ سے لوگوں کے درمیان کسی مقام و حیثیت کے حامل افراد ہیں مثلاً نبی اکرم ﷺ کا تقیہ کرنا، (اگر نبی ﷺ کے لیے تقیہ کرنا جائز ہو) یا آئمہ طاہرین علیہ السلام، فقہا، رؤسائے مذہب اور سلاطین و حکام کا تقیہ کرنا۔ ان میں سے ہر ایک کے تقیہ کے بارے میں جداگانہ بحث کی ضرورت ہے۔

## (د) متقی منہ (جس سے تقیہ کیا جاتا ہے) کے لحاظ سے تقیہ کی اقسام

ا۔ کفار و مشرکین سے تقیہ کرنا، خواہ وہ حکام و سلاطین ہوں یا رعایا۔ ۲۔ مخالف مذہب حکام و سلاطین سے تقیہ کرنا۔ ۳۔ مخالف مذہب فقہاء و قضات سے تقیہ کرنا۔ ۴۔ مخالف مذہب عوام سے تقیہ کرنا۔ ۵۔ شیعہ عوام اور حکام و سلاطین سے تقیہ کرنا۔ (26)

## (ج) متقی فیہ (جس چیز میں تقیہ کیا جاتا ہے) کے لحاظ سے تقیہ کی اقسام

ا۔ فعل حرام انجام دینے میں تقیہ کرنا۔ ۲۔ ترک واجب کرنے میں تقیہ کرنا۔ ۳۔ شرط و جزء ترک کرنے میں یا مانع و قاطع انجام دینے میں تقیہ کرنا۔ ۴۔ موضوع خارجی کے مطابق عمل کرنے میں تقیہ کرنا۔ مثلاً جس دن اہل سنت عید مناتے ہیں لیکن شیعہ کے نزدیک (عدم رویت ہلال کی وجہ سے) عید نہ ہو، اس دن افطار کرنے میں تقیہ کرنا وغیرہ۔ (27)

## مستثنیاتِ تقیہ

احکام ثانویہ کے دوسرے قواعد کی مانند قاعدہ تقیہ سے بھی کچھ موارد مستثنیٰ قرار پاتے ہیں۔ فقہاء نے ادلہ تقیہ، بالخصوص روایات اور قانون اہم و مہم سے استفادہ کرتے ہوئے جن امور کو قاعدہ تقیہ سے مستثنیٰ کیا ہے اور ان میں تقیہ کو حرام قرار دیا ہے، وہ یہ ہیں:

### ا۔ دین میں فساد کی صورت میں تقیہ حرام ہے۔

جو کام بھی دین میں فتنہ و فساد کا باعث بنے اور جس سے ارکان اسلام کے متزلزل ہونے اور شعائر الٰہی کے محو ہونے کا خطرہ ہو، اس میں تقیہ کرنا حرام ہے۔ مثلاً تقیہ کے طور پر کعبہ اور دوسرے مشاہد شریفہ کو اس طرح تباہ و برباد کرنا کہ ان کا اثر تک باقی نہ رہے یا مذہب کی ایسی تفسیر کرنا کہ جو الحاد کے مطابق ہو تو یہ تقیہ جائز نہیں ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں ہر اس کام میں تقیہ کرنا حرام ہے کہ جس پر عمل کرنا جان و مال

اور عزت وآبرو کی حفاظت سے زیادہ اہمیت کا حامل ہو۔یعنی ایسے امور کہ جن کی حفاظت کے لیے جنگ وجہاد اور جاں نثاری کرنا واجب ہے۔البتہ ان موارد کی تشخیص عام آدمی کا کام نہیں بلکہ مجتہد وفقیہ ہی ان کی تشخیص دے سکتا ہے کیونکہ اس کے لیے ادلہ شرعیہ پر تسلط ،ذوق شریعت اور تقویٰ وپرہیزگاری ضروری ہے۔

انہی امور میں سے ایک یہ ہے کہ اگر متقی (تقیہ کنندہ) کوئی بڑی، دینی واجتماعی شخصیت ہو اور اس کے تقیہ کرنے سے مذہب کی توہین ہوتی ہو یا دوسروں کی گمراہی کا اندیشہ ہو تو ایسی شخصیت کے لیے تقیہ کرنا جائز نہیں مثلاًوہ تقیہ کے طور پر بعض محرکات کا ارتکاب کرے (شراب پیئے یا زنا کرے) یا بعض واجبات کو ترک کرنے پر مجبور ہو (نماز، روزہ اور حج بجانہ لائے) تو یہاں دلیل رفع یا ادلہ تقیہ سے تمسک کرتے ہوئے تقیہ کا جواز مشکل ہے۔(28) اسی ضمن میں امام خمینی لکھتے ہیں:

ہر وہ چیز کہ جو اصول اسلام یا اصول مذہب میں سے کوئی اصل یا ضروریات دین میں سے کوئی ضرورت ہو، اور وہ زوال وتباہی اور تغیر کے خطرے سے دوچار ہو مثلاً بعض منحرفین اور طاغی افراد ارث، طلاق، نماز اور حج جیسے ''اصول احکام'' کو تبدیل کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں، چہ جائیکہ اصول دین یا اصول مذہب کو تبدیل کرنا چاہیں تو ایسے موقع پر تقیہ جائز نہیں۔(29) مستثنیات تقیہ کے اس مورد پر قاعدہ اہم ومہم کے علاوہ کچھ روایات بھی دلالت کرتی ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

ا۔عن مسعدة بن صدقه، عن ابی عبد الله علیه السلام فی حدیث۔ ان المؤمن اذا اظهر الایمان ثم ظهر منه مایدل علی نقضه خرج مما وصف وظهر وکان له ناقضاً الا ان یدع انه انّما عمل ذلک تقیة،ومع ذلک ینظر فیه،فان کان لیس مما یمکن ان تکون التیقة فی مثله لم یقبل منه ذلک،لان للتقیة مواضع من زالها عن مواضعها لم تستقم له و تفسیر مایتقیٰ مثل ان یکون قوم سوء ظاهر حکمهم وفعلهم علی غیر حکم الحق وفعله، فکل شیء المؤمن بینهم لمکان التقیة مما لایؤد الی الفساد الدین فانه جائز (30) یعنی:

"مسعدة بن صدقہ نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ اگر مومن اظہار ایمان کے بعد کوئی ایسا کام کرے جس سے ایمان کی نفی ہوتی ہو تو وہ مومنوں کی صف سے نکل جاتا ہے لیکن اگر وہ ادعا کرے کہ اس نے یہ کام تقیہ کے طور پر کیا ہے تو یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا اس کام میں تقیہ

جائز تھا یا نہیں؟ اگر اس کام میں تقیہ جائز نہیں تھا تو اس کا عذر قبول نہیں ہوگا کیونکہ تقیہ کی حدود معین ہیں جن کی خلاف ورزی کرنے والا قابل عفو نہیں۔ اور ''مایتقیٰ'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص ایسی بری قوم میں پھنسا گیا ہو جو ظالم بھی ہوں اور اس پر غلبہ بھی رکھتے ہوں تو اس صورت میں مؤمن کا ہر وہ فعل جو تقیہ کی بناء پر ہو اور جس سے دین میں فتنہ وفساد پیدا نہ ہو، جائز ہوگا۔"

۲۔"عن درست بن اَبی منصور قال: کُنتُ عند ابی الحسن موسیٰ علیہ السلام وعندہ الکمیت بن زید،فقال للکمیت:انت الذی تقول:

فالآن صرت الی اُمیة　　　　والاامورلها مصائر

قال :قلت ذاک و الله مارجعت عن ایمان،وانا لکم لموالٍ،ولعدوکم لقالٍ، ولکنی قلته علی التقیة،قال: ما لئن قُلت ذلک فی التقیة تجوز فی شرب الخمر"(31)

''درست بن ابی منصور کہتے ہیں: میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا اور کمیت ابن زید (معروف شاعر ومداح اہل بیت) بھی وہاں موجود تھے۔ امام (ع) نے کمیت (کو سرزنش کرتے ہوئے) فرمایا: کیا (یہ شعر) تم نے کہا ہے؟ ''اب میں بنی امیہ کے ساتھ ہوں اور ان کے امور کا پلٹنا میری ہی جانب ہے''۔

کمیت نے عرض کی: ہاں! میں نے ہی کہا ہے لیکن میں اپنے ایمان سے منحرف نہیں ہوں۔ میں اب بھی آپ کا موالی ہوں اور آپ کے دشمنوں کا دشمن ہوں لیکن میں نے یہ شعر ''تقیہ'' کے طور پر کہا ہے۔ تب امام نے اس سے فرمایا: اگر تقیہ ایسے ہی ہونے لگے تو پھر شراب بھی تقیہ کے طور پر جائز ہو جائے''۔

ان دونوں روایات سے جو نکتہ اخذ ہوتا ہے، وہ یہی ہے کہ تقیہ کی کچھ حدود معین ہیں جن کی مراعات ضروری ہے۔ ورنہ تقیہ پر عمل، اطاعت کے بجائے نافرمانی شمار ہوگا۔ چنانچہ قاعدہء تقیہ کے مجاری کی پہچان اور تشخیص ضروری ہے ورنہ 'کمیت' جیسے بر جستہ شاعر اور محب اہل بیت کو بھی ان حدود کی شناخت نہ رکھنے کی وجہ سے امام وقت کی طرف سے سرزنش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ امام کاظم علیہ السلام کی اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنی امیہ جیسے ظالموں کی مدح کرنے میں تقیہ جائز نہیں چونکہ ان جیسے لوگوں

کی طرفداری کفر کی بنیادوں کو مضبوط کرنے اور گمراہی وجہالت کو فروغ دینے کا موجب بنتی ہے۔پس کفروضلال کو تقویت پہنچانے والی ہر بات میں تقیہ حرام ہے۔خواہ وہ ایک شعر کی حد تک ہی کیوں نہ ہو۔

## ۲۔شراب خوری، موزوں پر مسح اور متعہ حج میں تقیہ کی حرمت

بعض روایات میں شراب خوری، موزوں پر مسح کرنے اور متعہ حج میں تقیہ حرام قرار دیا گیا ہے۔ چند روایات ملاحظہ فرمائیں:

(ا) عن زرارة قال: قلت له: فی مسح الخفین تقیة؟ فقال: ثلاثة لا اتقی فیهن احدا شرب المسکر، ومسح الخفین،ومتعة الحج، قال زرارة: ولم یقل الواجب علیکم ان لاتتقوا فیهن احداً(32) یعنی: "زرارۃ سے منقول ہے کہ میں نے امام (ع) کی خدمت میں عرض کیا: کیا موزوں پر مسح کرنے میں تقیہ ہے؟آپ نے فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں جن میں سے کسی میں بھی ،میں تقیہ نہیں کرتا۔نشہ آور چیز (یعنی شراب) میں، موزوں پر مسح کرنے میں اور متعہ حج میں ۔زرارۃ کہتے ہیں۔امام نے یہ نہیں فرمایا کہ تم پر واجب ہے کہ ان میں سے کسی چیز میں تقیہ نہ کرو''۔

(۲)ایک دوسری جگہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:والتقیة فی کل شئ لا فی النبیذ والمسح علی الخفین (33)''نبیذ (شراب)اور موزوں پر مسح کے علاوہ ہر چیز میں تقیہ جائز ہے۔''

ان روایات کے مطالعے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان امور میں تقیہ کی حرمت کا فلسفہ کیا ہے اور یہ چیزیں دوسری چیزوں کے ساتھ تقیہ کرنے میں کیوں مختلف حکم رکھتی ہیں؟ بعض محققین نے اس سوال کے جواب میں کچھ توجیہات پیش کی ہیں (34) جو یہ ہیں:

(ا)روایت میں نفی تقیہ سے مراد وہ امور ہیں کہ جن میں زیادہ مشقت نہیں ہوتی یعنی ایسی مشقت کہ جو جان ومال کے خوف کا سبب نہ بنے۔

(۲)شاید امام کی مراد یہ ہو کہ میں ان امور میں فتویٰ دینے میں کسی سے تقیہ نہیں کرتا کیونکہ ان امور کی حرمت مخالفین کی مذہب میں بھی واضح وروشن ہے۔

(۳)مذکورہ تینوں امور کے بارے میں اکثر اہل سنت انکار نہیں کرتے کیونکہ وہ متعہ حج ، حرمت مسکر اور وضو کے بعد پاؤں دھونے کے لیے جوتے اتارنے کے منکر نہیں ہیں لہٰذا ان امور میں تقیہ بلاوجہ ہے۔
(۴) کیونکہ ان موارد میں کسی قسم کے ضرر و نقصان کا اندیشہ نہیں ہوتا، لہٰذا تقیہ ضروری نہیں ہے۔
(۵)ان موارد میں ترک تقیہ کی بہترین دلیل قرآن وسنت ہے کیونکہ متعہ حج کے بارے میں قرآن میں حکم موجود ہے (35) اور موزوں پر مسح نہ کرکے صرف پاؤں پر مسح کرنے کے بارے میں بھی قرآن میں صراحت موجود ہے۔ (36) چونکہ سر یا پاؤں پر مسح تب ہی ہوگا جب ٹوپی یا موزے اتار کر فقط سر یا پاؤں پر مسح کیا جائے گا۔ (37)
(٦)پہلی روایت میں امام نے "ثلاثة لااتقی فیهن احداً" فرما کر فقط اپنا شخصی حکم بیان کیا ہے۔ چونکہ روایت کے ذیل میں زرارۃ کا یہ جملہ بھی نقل ہوا ہے کہ "ولم یقل الواجب علیکم ان لاتتقوا فیهن احداً" (38) لیکن ان تمام توجیہات کے باوجود اگر ضرورت پڑ جائے تو مذکورہ تینوں موارد میں تقیہ کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً اگر جان خطرے میں ہو تو جان کی حفاظت، شراب نہ پینے یا موزوں پر مسح نہ کرنے سے زیادہ اہم ہے لہٰذا یہاں جان کے خوف کی وجہ سے تقیہ جائز ہو جاتا ہے۔ اس بات کی تائید درج ذیل روایت سے بھی ہوتی ہے:
عن بی الورد قال: قُلتُ لابی جعفر: اِن ابا ظبیان حدّثنی انه رایٰ علیاً راق الماء، ثمّ مسح علی الخفین، فقال: کذب ابوظبیان، ما بلغک قول علی علیه السلام فیکم: سبق الکتاب الخفین؟ فقُلتُ: هل فیهما رخصة؟ فقال: لا،لا من عدو تقیة، وثلج تخاف علیٰ رجلیک (39) یعنی: "ابی الورد سے منقول ہے کہ میں نے امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ ابوظبیان نے مجھ سے کہا کہ: میں (ابوظبیان) نے علی علیہ السلام کو دیکھا ہے کہ انہوں نے پانی بہادیا اور موزوں پر مسح کیا، امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: ابوظبیان نے جھوٹ بولا ہے۔ کیا تم نے علی علیہ السلام کا یہ قول نہیں سنا کہ قرآن میں تمہارے لیے خفین کا حکم بیان ہو چکا ہے؟ میں نے عرض کی: کیا اس میں رخصت ہے؟ تو آپ نے فرمایا: نہیں، مگر یہ کہ دشمن سے تقیہ کے طور پر یا پاؤں کو برف سے بچانے کے لیے موزوں پر مسح کرنے کی اجازت ہے"۔

صاحب جواہر بھی مذکورہ بالا احتمالات ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: لم نعثر علی عامل بهذا الروایة ومَن استثنیٰ ذلک من عمومات التقیة (40)یعنی: ''میں نے کسی کو اس روایت پر عمل کرتے نہیں پایا اور نہ اس مورد کو عموماتِ تقیہ سے استثناء کرتے دیکھا ہے۔''

پس خلاصہ یہی ہے کہ مذکورہ تینوں امور میں زیادہ خوف وخطرہ نہیں ہوتا، اس لیے ان میں تقیہ کرنا بے جا ہے چونکہ تقیہ خوف وخطرے کی صورت میں جان کی حفاظت کے لیے ہے۔ بالفرض ان امور میں بھی جان وغیرہ کا خطرہ ہو تو تقیہ جائز ہو جائے گا اور یہ (تینوں) موارد تقیہ کے مستثنیات میں سے نکل جائیں گے۔

## ۳۔ قتل میں تقیہ جائز نہیں

یعنی جب بھی انسان کی جان ومال یا عزت وآبرو کسی بے گناہ شخص کے قتل پر موقوف ہو جائے تو یہاں انسان اپنی جان ومال یا عزت وآبرو کی حفاظت کے لیے تقیہ نہیں کر سکتا اور کسی بے گناہ کو قتل نہیں کر سکتا۔ متعدد روایات اس قسم کے تقیہ کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں منجملہ ایک روایت میں محمد بن مسلم امام باقر علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں: اِنَّماجعلت التقیة لیحقن بها الدم،فاذا بلغ الدم فلیس تقیة (41) یعنی: ''تقیہ (کاحکم) جان کی حفاظت کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ جب یہ خود جان لینے کا سبب بن جائے تو یہاں تقیہ جائز نہیں ہے''۔ نص کے علاوہ فتاویٰ میں بھی اس قسم کے تقیہ کو حرام قرار دیا گیا ہے۔(42)

## ۴۔ آئمہ طاہرین سے اظہارِ برائت میں تقیہ

آئمہ طاہرین بالخصوص امیر المؤمنین علی علیہم السلام سے اظہار برائت کرنے میں تقیہ کے جواز وعدم جواز کے بارے میں مختلف روایات ملتی ہیں جن میں سے بعض عدم جواز پر دلالت کرتی ہیں، بعض رخصت پر دلالت کرتی ہیں اور بعض میں وجوبِ برائت پر دلالت ملتی ہے۔ اظہار برائت کے عدم جواز پر دلالت کرنے والی ایک روایت یہ ہے: عن محمد بن میمون ،عن جعفر بن محمد، عن ابیه،عن جده قال: قال اَمیرُ المومنین (علیه السلام): ستدعون اِلی سبّی فسبّونی، وتدعون اِلی البرائة مِنی فمدوا الرقاب،فاِنی علی الفطرة (43) یعنی: "محمد بن میمون سے

منقول ہے کہ امام جعفر صادق نے اپنے والد ماجد سے نقل کیا ہے کہ: امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے فرمایا: عنقریب تم کو مجھے بُرا کہنے کے لیے کہا جائے گا، تم مجھے (العیاذباللہ) بُرا کہہ دینا (پھر) تمہیں مجھ سے اظہارِ برائت کرنے کو کہا جائے گا، تم اپنی گردن کٹا دینا (مگر مجھ سے اظہارِ برائت نہ کرنا) چونکہ میں فطرت اسلام پر ہوں''۔

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''سب'' کرنے میں تقیہ جائز ہے لیکن اظہار برائت میں جائز نہیں۔ اسی مضمون کی ایک روایت علی بن الخزاعی نے امام رضا علیہ السلام سے بھی نقل کی ہے۔(44) اسی طرح بعض دوسرے منابع میں بھی اس قسم کی روایات ملتی ہیں۔رخصت پر دلالت کرنے والی ایک روایت یہ ہے: محمد بن مسعود العیاشی فی (تفسیرہ)عن اَبی بکر الحضرمی، عن اَبی عبد الله (علیه السلام )۔فی حدیث ۔اَنه قیل له: مد الرقاب اَحبّ الیک اَما البرائة مِن علی(علیه السلام)؟ فقال: الرخصة اَحبّ اِلیّ،اَمّاسمعتَ قول الله عزّوجل فی عمار: ''اِلَّا مَنۡ اُکۡرِہَ وَقَلۡبُہٗ مُطۡمَئِنٌّۢ بِالۡاِیۡمَانِ' (45) یعنی: "محمد بن مسعود عیاشی اپنی تفسیر میں ابوبکر حضرمی کے حوالے سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ امام کی خدمت میں عرض کیا گیا: آپ کو گردن کٹا دینا پسند ہے یا علی علیہ السلام سے اظہارِ برائت کرنا؟ آپ نے فرمایا: مجھے رخصت پسند ہے ۔کیا تم نے عمار کے بارے میں خداوند عزوجل کا یہ قول نہیں سُنا: ''مگر وہ شخص جس کو مجبور کیا جائے حالانکہ اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو''۔

وجوب برائت ([46]) پر دلالت کرنے والی ایک روایت یہ ہے:

عن مسعدة بن صدقه قال: قلتُ لاَبی عبد الله (علیه السلام ):انَّ النَّاس یَرَونَ انَّ عَلیًّا(علیه السلام) قال علی منبر الکوفة: ایُّهَا النَّاس اِنَّکُم ستدعونَ الی سبّی فَسبّونی، ثم تدعون الیٰ البرائة مِنّی فلاتَبرَؤوا منّی، فقال: ماکثر مایکذب الناس علیٰ علی(علیه السلام) ثم قال: انّماقال: انَّکُم سَتَدعونَ الیٰ سبّی فسبّونی،ثم تَدعونَ الیٰ البرائةمِنی وَ انّی لعلیٰ دین محمد (ﷺ) ولم یقل: وَلاتبرؤوا مِنّی، فقال له السائل: ارایت ان اختار القتل دون البرائة؟ فقال: والله ماذلک علیه وماله الَّا مامضیٰ علیه عمار بن یاسر حیث اکرهه اهل مکّة وقلبه مطمئن بالایمان، فنزل الله عزوجل فیه:''اِلَّا مَنۡ اُکۡرِہَ وَقَلۡبُہٗ

مُطۡمَئِنٌّ بِالۡاِیۡمَانِ' فقال له النبیّ(ص) عندها: یا عمار ان عادوا فعد، فقد انزل اللهعذرک وامرکَ ان تعود ان عادوا (47)

یعنی: "مسعدۃ بن صدقہ سے منقول ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے عرض کی: لوگ کہتے ہیں کہ: علی علیہ السلام نے منبر کوفہ سے اپنے خطاب میں فرمایا: اے لوگو! عنقریب تم کو مجھ پر سب وشتم کرنے پر مجبور کیا جائے گا، تو اس وقت تم مجھ پر سب وشتم کر سکتے ہو۔ پھر تمہیں مجھ سے اظہار برائت کے لیے کہا جائے گا، تم مجھ سے اظہار برائت نہ کرنا...اس پر امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: لوگ علی علیہ السلام کے بارے میں کس قدر جھوٹ بولتے ہیں۔ حالانکہ علی علیہ السلام نے یوں فرمایا تھا: ''تمہیں مجھ پر سب وشتم کرنے کے لیے کہا جائے گا تو کر دینا۔ پھر اظہار برائت کے لیے کہا جائے گا تو یاد رکھو میں دین محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ہوں۔آپ نے یہ نہیں فرمایا: ''مجھ سے اظہار برائت نہ کرنا''۔اس پر سائل نے (امام صادق علیہ السلام سے) عرض کی: کیا آپ فرماتے ہیں کہ میں اظہار برائت کے بجائے قتل ہو جاؤں ؟ تو آپ نے فرمایا: ''حضرت علی علیہ السلام کی مراد یہ نہیں، اس سے مراد عمار بن یاسر کا طریقہ ہے جوانھوں نے کفار مکہ کے مجبور کرنے پر اختیار کیا تھا، جبکہ ان کا دل ایمان سے مطمئن تھا۔ جس پر خداوند متعال یہ آیت نازل فرمائی''مگروہ شخص جس کو مجبور کیا جائے حالانکہ اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو''، تو رسول خدا ﷺ نے عمار سے فرمایا: اے عمار! اگر وہ لوگ دوبارہ مجبور کریں تو تم پھر وہی کرو ۔خداوند نے تیرے عذر سے مجھے آگاہ کر دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ اگر وہ تمہیں پھر مجبور کریں تو تم پھر وہی طریقہ اختیار کرو۔"

اس حدیث میں امام صادق علیہ السلام نے حضرت عمار کے قصہ سے استشہاد کرکے وجوب تقیہ کی نفی کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہاں تقیہ کرنا حرام نہیں بلکہ تقیہ کے طور پر برائت کی جا سکتی ہے۔آئمہ طاہرین سے تقیہ کے طور پر اظہار برائت کے جواز وعدم جواز کے متعلق منقول روایات میں بظاہر تضاد وتناقض نظر آتا ہے اور یہ جاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ اظہار برائت کا مسئلہ مستثنیات تقیہ میں سے ہے یا نہیں؟ لیکن اگر ان روایات کو سند ومتن کے لحاظ سے زمان ومکان کے [ تقاضوں اور متقی ( تقیہ کنندہ) افراد کی شخصیت

واجتماعی حیثیت کے اعتبار سے عقل ودرایت کی کسوٹی پر پرکھا جائے توان کا تضاد وتناقض ختم ہو جاتا ہے اوران روایات میں ایک قسم کا ربط ونظم برقرار ہو جاتا ہے۔لہٰذااس قسم کی روایات کو درست طور پر سمجھنے کے لیے چند نکات کی طرف توجہ ضروری ہے۔

آئمہ طاہرین کے فرمودات کاسب سے بڑا امتیازیہ ہے کہ یہ حضرات زمان ومکان کے تقاضوں اور مخاطبین کے ایمانی درجات فہم وشعوراور صبر واستقامت کومد نظرر کھ کر کوئی حکم صادرفرماتے تھے۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض روایات میں ایک موضوع کے بارے میں مختلف حکم ملتے ہیں۔اس کافلسفہ یہی تھاکہ آئمہ اطہار (ع)، مخاطب کی شخصیت، فہم،شعوراورزمان ومکان کے تقاضوں کے مطابق حکم اولی وحکم ثانوی بیان فرماتے تھے۔چونکہ امام معصوم سے زیادہ بھلا کون حکم اولی وحکم ثانوی کے موقع ومحل کی تشخیص کر سکتا ہے۔

اسی لیے آئمہ اطہار بالخصوص امیر المؤمنین علی علیہم السلام سے اظہار برائت کے بارے میں تقیہ کرنے کے جواز وعدم جواز کا حکم بھی مختلف ملتا ہے چونکہ آئمہ طاہرین کے مخاطبان نہ صرف اپنے زمانے کے لوگ تھے بلکہ اپنے علم لدنی کی وجہ سے وہ آئندہ زمانے کے حالات کو بھی حکم بیان کرتے وقت مد نظر رکھتے تھے۔چونکہ اظہار برائت کومسئلہ ہر زمانے میں اور ہر قسم کے اشخاص کو پیش آسکتا ہے۔لہٰذا روایات میں ان سب چیزوں کومد نظر رکھ کے حکم دیا گیاہے۔ کیونکہ تقیہ کا فلسفہ نہ فقط مسلمانوں کی جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر اساس دین ومذہب کی حفاظت بھی ہے۔ ہو سکتا ہے ایک وقت میں کسی طرح کا اظہار برائت کرنے سے پورے دین ومذہب کی اساس ہی خراب ہو جائے اورایک دوسرے وقت میں اظہار برائت نہ کرنے سے دین پر تو کوئی حرف نہ آئے، لیکن کئی قیمتی جانیں بغیر کسی اہم فائدے کے ضائع ہو جائیں۔اس مسئلہ کو اگر تاریخ کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس مسئلہ کا فہم آسان ہو جاتا ہے۔

ایک زمانہ وہ تھا کہ جب بنی امیہ وبنی عباس جیسے دشمنان اسلام اپنے دنیوی اقتدار کی خاطر رسول اسلام ﷺ کے حقیقی جانشینوں یعنی آئمہ طاہرین کے نام ونشان کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتے تھے اور مختلف حیلوں بہانوں سے امت اسلام کوان ذوات مقدسہ سے دور رکھنے کے لیے اہل بیتؑ سے اظہار برائت پر مجبور کرتے تھے۔ ایسے حالات میں ان ذوات قدسیہ سے اظہار برائت کے سلسلے میں تقیہ کرنااور آئمہ اہل بیت کے

مذہب ومشن سے اظہار برائت کرنا، دشمنوں کے اہداف کی تکمیل کے مترادف تھا۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ آئمہ معصومین علیہ السلام کے باوفا اصحاب اور ساتھیوں میں سے کوئی بھی شخص ایسا نظر نہیں آتا جس نے آئمہ سے برائت کا اظہار کیا ہو یا اس سلسلے میں تقیہ جیسی رخصت سے استفادہ کیا ہو، سوائے یہ کہ خود آئمہ نے اسے اس کام پر مامور کیا ہو چنانچہ حجر بن عدی، میثم تمار، عمرو ابن الحمق، عبد اللہ بن عفیف، سعید بن جبیر رضوان اللہ علیہم نے آئمہ اہل بیتؑ سے صرف اپنا قوی رابطہ برقرار رکھنے کے جرم میں ہی اپنی جانیں قربان کر ڈالیں اور کسی بھی مقام پر تقیہ کو سپر بناتے ہوئے آئمہ سے اظہار برائت نہیں کیا چونکہ یہ لوگ مکتب اہل بیتؑ کے پرورش یافتہ تھے اور تعلیمات اہل بیت سے مکمل طور پر آگاہ ہونے کی وجہ سے حکم اولی وحکم ثانوی کی بہتر تشخیص دے سکتے تھے۔ لہٰذا ان مقدس ومتشرع افراد کی سیرت ایسے نازک وحساس موقعوں پر ترک تقیہ کے رجحان پر بہترین دلیل ہے اور آئمہ معصومین کی ان روایات کی تائید کرتی ہے کہ جن میں اظہار برائت میں ترک تقیہ کا حکم ملتا ہے۔

اس کے مقابلے میں ایک ایسا زمانہ بھی ہے کہ جس میں آئمہ طاہرین علیہ السلام سے اظہار برائت کرنے یا نہ کرنے سے کسی دینی ومذہبی اساس پر خدشہ وارد ہونے کا اندیشہ نہیں ہوتا یا اظہار برائت پر مجبور ہونے والے افراد بھی کسی قسم کی دینی ومذہبی شخصیت کے حامل نہیں ہیں، یعنی عام لوگ ہیں اور ان کے کسی قول وفعل سے اساس دین ومذہب کے بگڑنے کا اندیشہ نہیں ہے۔ اس صورت میں ان عام مؤمنین کی جانیں اگر آئمہ معصومین سے ظاہری رابطہ کٹ جانے یا اظہار عقیدہ نہ کرنے کی وجہ سے محفوظ رہ جاتی ہیں تو ان کے لیے تقیہ کرنا یقینا عقل وشرع کے مطابق ہوگا۔

بالفرض اگر وہ اپنے جذبات واحساسات کے زیر اثر آئمہ اطہار سے اظہار عقیدت کرنے کی وجہ سے اپنی اور دوسرے مؤمنین کی جانوں کو خطرے میں ڈالتے ہیں اور ان کے اس عمل سے بلاوجہ جانوں کے تلف ہو جانے کے سوا اور کوئی عقلی فائدہ حاصل نہیں ہوتا تو یہاں آیہ مجیدہ: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (48) کی مخالفت کے سبب ان کا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا خلاف عقل وشرع شمار ہوگا۔ لہٰذا تقیہ کے وجوب وعدم وجوب میں موقع ومحل کی تشخیص اور تقیہ کرنے والے افراد کا مقام ومنزلت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لیے فقہاء نے تقیہ کو احکام خمسہ (واجب، مستحب، مکروہ، حرام اور مباح) میں تقسیم کیا ہے۔ ہمارے اس بیان کی تائید بعض روایات سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک روایت ہے کہ:

عن محمد بن مروان قال: قال لی ابوعبد اللهعلیه السلام: ما منع میثم رحمه الله من التقیة؟ فو الله لقد علم انَّ هذه الآیة فی عمار واصحابه: ''اِلَّا مَنۡ اُكۡرِهَ وَقَلۡبُهٗ مُطۡمَئِنٌّ بِالۡاِيۡمَانِ' (49) یعنی: "محمد بن مروان سے منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے مجھ سے فرمایا: میثم پر خدا رحمت کرے اس کو کس چیز نے تقیہ سے روکا تھا؟ خدا کی قسم! وہ جانتا تھا کہ یہ آیت ''اِلَّا مَنۡ اُكۡرِهَ وَقَلۡبُهٗ مُطۡمَئِنٌّ بِالۡاِيۡمَانِ...الخ'' عمار اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے''۔

اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ امام، میثم کی صورتحال اور عمار کی صورتحال میں فرق بتانا چاہتے ہیں یعنی حضرت میثم، حضرت عمار کے بارے میں نازل ہونے والی آیت سے آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ اکراہ کی صورت میں تقیہ کا حکم بھی موجود ہے لیکن وہ آئمہ اطہار سے اپنی غیر معمولی وابستگی اور اپنے زمانے کے تقاضوں کا ادراک رکھتے تھے اور جانتے تھے کہ عمار کے زمانے میں اور میرے زمانے میں فرق ہے۔ عمار کے زمانے میں مؤمنین کی تعداد انتہائی کم تھی۔ ایک مؤمن کا فقدان بھی اسلام کے لیے غیر معمولی نقصان تھا۔ لہٰذا کفار ومشرکین کے مقابلے میں تقیہ کرنا ہی ان کا فریضہ تھا جبکہ بنی امیہ کے مقابلے میں آئمہ اطہار سے اظہار عقیدت میرے جیسے شخص کا فریضہ ہے۔ پس انہوں نے اپنے بلند مقام ومرتبہ کے ساتھ قتل ہوجانے کو ترجیح دی اور آئمہ سے برائت کرنے میں تقیہ نہیں کیا۔ اس روایت سے مقامات تقیہ میں فرق بھی واضح ہوجاتا ہے کہ بعض اوقات ترک تقیہ ترجیح رکھتا ہے۔

مذکورہ بالا وضاحت سے پتہ چلتا ہے کہ تقیہ کے دوسرے موارد کی طرح اظہار برائت کے سلسلے میں بھی تقیہ کرنے یا نہ کرنے میں زمان ومکان اور متقی (تقیہ کنندہ) افراد کی منزلت کو گہرا دخل حاصل ہے۔ پس یہ مسئلہ فقط بنی امیہ وبنی عباس کے دور سے ہی مختص نہیں بلکہ آج کے زمانے میں بھی اظہار برائت کے سلسلے میں تقیہ کے موارد کی تشخیص ضروری ہے۔ بالخصوص ہمارے ملک میں انقلاب اسلامی کے بعد جو حالات پیدا ہوچکے ہیں اور دشمنان اسلام اہل بیت اطہار سے اظہار عقیدت و مودّت کے جو اثرات دیکھ چکے ہیں، جن کے بعد وہ ان ذوات مقدسہ کی عقیدت اور مودّت کو مسلمانوں کے دلوں سے نکالنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں اور اہل بیت سے اظہار برائت کروانے کے لیے قلم وبیان جیسے سرد ہتھیاروں

سے لے کر کلاشنکوفوں جیسے گرم ہتھیاروں تک استعمال کر رہے ہیں، ایسے موقع پر اگر کوئی بلند پایہ مذہبی و دینی شخصیت اہل بیت اطہار سے اظہار برائت کرنے یا اس سے ملتا جلتا کوئی فعل انجام دینے پر مجبور کی جاتی ہے تو یہاں اس کا وہی فریضہ ہے جس پر حجر بن عدی و میثم تمار جیسے بزرگوں نے عمل کیا تھا، اور تقیہ ترک کرتے ہوئے اپنی جانوں کے بدلے عقیدت و مودّت اہل بیت کے نوخیز پودے کو پروان چڑھایا تھا۔ اگر اس سلسلے میں یہ مذہبی و دینی شخصیت تقیہ کو بہانہ بنا کر کسی قسم کی کوتاہی کا مظاہرہ کرتی ہے تو یہ اس کا اپنے فرائض سے فرار اور آئمہ اہلبیت کے مشن پر ظلم کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔ جبکہ اس کے مقابلے میں عام لوگوں کا فریضہ یہی ہے کہ وہ کسی عقلی فائدے کے نہ ہوتے ہوئے اپنی اور دوسرے مؤمن کی جانوں کو تلف ہونے سے بچائیں اور ایسا کوئی جذباتی قدم نہ اٹھائیں جس کا نتیجہ قیمتی جانوں کے تلف ہونے کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ پس اظہار برائت کے سلسلے میں منقول روایات سے پتہ چلتا ہے کہ بعض موارد میں یہ روایات اظہار برائت کو مستثنیات تقیہ میں سے قرار دیتی ہیں اور بعض دوسرے موارد میں اظہار برائت مستثنیات تقیہ میں سے نہیں ہوگا، بلکہ وہاں تقیہ کرنا ہی فریضہ قرار پائے گا۔

## امام حسین علیہ السلام کا تقیہ نہ کرنا

اس تمہید کے بعد اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں اور وہ یہ کہ میدان کربلا میں امام حسین علیہ السلام نے تقیہ کیوں نہیں کیا۔ اگر امام عالی مقام تقیہ کر لیتے تو شاید عالم اسلام میں یہ واقعہ پیش نہ آتا۔ یہ وہ شبہ یا سوال ہے کہ جو مخالفین کے علاوہ خود پیروان اہل بیت کے اذہان میں بھی پیدا ہو سکتا ہے چونکہ ائمہ اطہار نے تقیہ کی بہت زیادہ تاکید کی ہے۔ تقیہ کے بارے میں گذشتہ صفحات میں تمہید کے طور پر جو مفصل وضاحت پیش کی گئی ہے، اس کی روشنی میں امام حسین کے تقیہ نہ کرنے کے بارے میں چند نکات پیش کئے جاتے ہیں:

ا۔ قانون تقیہ کا فلسفہ جہاں مؤمنین کی جان و مال اور عزت وآبرو کو بلاوجہ تلف ہونے سے بچانا ہے، وہاں دین اسلام کی حفاظت کرنا بھی ہے۔ اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ دین اسلام کی حفاظت اہم ترین واجبات میں سے ہے اور کبھی ایسی صورت حال بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ جس میں دین ومذہب پر جان و مال اور عزت وآبرو تک قربان کرنا واجب ہو جاتا ہے اور دین کا محفوظ رہنا، جان کی بازی

لگا دینے پر موقوف ہو جاتا ہے ۔ایسے حالات میں ایک خالص اور سچا مؤمن کسی قسم کی مصلحت اندیشی نہیں کرتا۔ چہ جائیکہ امام معصوم کہ جس کا فریضہ ہی دین ومذہب کی حفاظت کرنا ہے۔

اسی لیے تقیہ کو احکام پنجگانہ میں تقسیم کیا جاتا ہے یعنی کبھی تقیہ واجب ہو جاتا ہے اور کبھی حرام، کبھی مستحب اور کبھی مکروہ اور کبھی مباح۔ مستثنیات تقیہ میں بھی واضح کیا جا چکا ہے کہ تقیہ اگر انہدام دین کا باعث بن رہا ہو تو وہاں وہ حرام ہو جاتا ہے۔ پس تعلیمات دین اور ارکان اسلام کی حفاظت کے لیے کبھی تقیہ کرنا واجب ہوتا ہے اور کبھی تقیہ نہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ مقصد ،دین کی حفاظت ہے۔ خواہ تقیہ کرنے سے انجام پائے خواہ ترک تقیہ سے۔اسی طرح تقیہ مؤمنین کی جان ومال کو محفوظ رکھنے کے لیے کیا جاتا ہے لیکن اگر تقیہ کرنے سے مؤمنین کی جان وغیرہ تو بچ جائے مگر مذہب ودین پر حرف آئے تو یہاں ترک تقیہ ضروری ہو جاتا ہے۔

۲۔مسئلہ تقیہ میں تقیہ کرنے والے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اسے کہاں تقیہ کرنا ہے اور کہاں تقیہ نہیں کرنا۔ تقیہ کے موارد ومجاری سے آگاہی ایک ضروری امر ہے۔ ہو سکتا ہے عام لوگ تقیہ کے موارد کی درست پہچان نہ رکھتے ہوں اور اپنی کم علمی کی بناء پر جہاں تقیہ کرنا چاہیے، وہاں تقیہ ترک کردیں اور جہاں ترک تقیہ ضروری ہے، وہاں تقیہ کرنے لگیں جبکہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔زمان ومکان کے تقاضوں کے مطابق زندگی کے نشیب وفراز میں صحیح راہ اپنانا اکثر لوگوں کے لیے مشکل ہوتا ہے۔اسی لیے امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: عَلَی العَاقِلِ اَن یَکُونِ عَارِفاً بِزمَانِہِ مُقبِلاً عَلٰی شَانِہ (50) یعنی: "عاقل انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے زمانے کو پہچانے اور اپنے فریضہ پر عمل کرے۔"

حقیقی مؤمن کی پہچان یہی ہے کہ وہ اپنے زمانے سے آگاہ ہوتا ہے، وہ زندگی کے نشیب وفراز کو طے کرنا جانتا ہے۔ اسے دنیا دھوکہ نہیں دے سکتی۔ وہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق،دین اسلام کے احکام کو جاری کرتا ہے چونکہ دین اسلام ہر زمانے کے لیے ہے۔ پس مؤمن کو بھی چاہیے کہ وہ ہر دور میں دین اسلام پر عمل کرے۔ مگر یہ کام وہی کرسکتا ہے جو احکام دین سے آگاہ ہو اور ''تفقہ فی الدین'' کی صفت سے متصف ہو۔اگر ایک مؤمن کے لیے یہ سب باتیں ضروری ہیں تو کیا امام معصوم کو ان صفات کا حامل نہیں ہونا چاہیے ؟اور اپنے زمانے کے تقاضوں سے آگاہ نہیں ہونا چاہیے ؟یقینا امام معصوم اور وہ بھی

حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام جیسی ہستی اپنے زمانے کے تقاضوں سے بھی پوری طرح آگاہ تھی اور احکام اسلام سے بھی مکمل طور پر مطلع تھی۔

امام عالی مقام جانتے تھے کہ کہاں تقیہ کرنا چاہیے اور کہاں تقیہ کے بجائے جان قربان کرنی چاہیے اور یہ بات ہر وہ مسلمان بھی جانتا ہے کہ جو امام حسین علیہ السلام کے مقام و مرتبے سے آگاہ ہے۔ یہی صفات عالیہ تھیں کہ جن کی وجہ سے اپنے دونوں نواسوں کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَلحسنُ والحُسَینُ سَیداشَبابِ اھلِ الجَنَّۃِ وَ ھُما اِمامانِ قاما او قَعِدا''(51) یعنی ''حسن اور حسین جوانان اہل جنت کے سردار ہیں اور وہ ہر دو امام (ورہبر) ہیں خواہ حالت قیام میں ہوں یا حالت قعود میں۔"

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا برسوں پہلے،ان دواماموں کے بارے میں اس طرح کی وصیت کرنا اسلام میں ان کی عظمت اور قابل اقتداء ہونے کی دلیل ہے۔یعنی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُمت کو وصیت فرمارہے ہیں کہ حسن و حسین علیہما السلام جس حالت میں بھی ہوں، قابل اقتداء ہیں اور ان کی پیروی کرنی ضروری ہے۔خواہ وہ کسی کے ساتھ صلح کی حالت میں ہوں یا جنگ کی حالت میں۔ کیونکہ وہ احکام دین سے بھی آگاہ ہیں اور زمان ومکان کے تقاضوں کو بھی دوسروں کی نسبت بہتر جانتے ہیں۔پس اگر امام حسن علیہ السلام، زمانہء معاویہ میں تقیہ کواپناتے ہوئے اس سے صلح کر لیتے ہیں تو اس میں بھی دین اسلام کی حفاظت امام کے مد نظر تھی اور اگر امام حسین علیہ السلام یزید کے مقابلے میں تقیہ ترک کرکے اعلان جنگ فرماتے ہیں تو یہ بھی دین کی حفاظت کے لیے تھا۔ ورنہ یہی امام حسین (ع) زمانہء معاویہ میں کئی برس، تقیہ کی حالت میں گزارتے ہیں اور معاویہ کے خلاف قیام نہیں فرماتے کیونکہ امام کی نظر میں معاویہ اور یزید کا زمانہ مختلف تھا اور ہر زمانے کے تقاضوں کے مطابق احکام اسلام پر عمل کیا جاتا ہے۔

تاریخ مسلمین کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یزید کا دور مسلمانوں کی تاریخ میں ایک استثنائی دور تھا۔ایسا دور کہ جس میں دین اسلام کی بنیادیں ہلنے لگی تھیں۔یزید تمام احکام اسلام کو پائمال کر رہا تھا۔ شراب نوشی، عیاشی اور کتوں اور بندروں سے کھیلنا،مکہ معظّمہ ومدینہ منورہ پر حملہ کرنا،مدینہ منورہ میں قتل وغارت۔ یہ سب یزید کے کارنامے تھے کہ جن سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ایسی حالت میں کوئی بھی حقیقی مؤمن خاموشی اختیار نہیں کرسکتا تھا۔ چہ جائیکہ امام حسین علیہ

السلام جیسی ہستی، کہ جو خود محافظ دین تھے، وہ کیسے احکام دین کو اس طرح پائمال ہوتا دیکھتے۔ گو کہ یزید کے لیے یہ سب مقدمات اس کے باپ معاویہ نے فراہم کئے تھے لیکن وہ خود زیرک تھا۔ کھلے عام احکام اسلام کی خلاف ورزی نہیں کرتا تھا اور محافظین دین کو اپنے خلاف قیام کرنے کا موقع نہیں دیتا تھا۔ اس نے یزید کو بھی یہی وصیت کی تھی کہ کھلے عام احکام دین کی توہین نہ کرنا، فلاں فلاں بزرگان دین سے نہ ٹکرانا، سیاست سے کام لینا لیکن یزید اس قدر عیاش، بے دین اور لاابالی تھا کہ اس نے اقتدار کی کرسی پر قدم رکھتے ہی دین اسلام کی جڑیں اکھاڑنی شروع کر دیں۔ اگر یزید کو اس طرح کھلی چھٹی دے دی جاتی تو آج نہ تو روئے زمین پر احکام اسلام باقی رہتے اور نہ ہی کوئی سچا مسلمان باقی رہتا۔

اس کے علاوہ یزید، امام حسین علیہ السلام کو اپنی بیعت کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ یعنی وہ چاہتا تھا کہ امام عالی مقام اس کی بیعت کر کے اس کے تمام غیر شرعی کاموں پر مہر تصدیق ثبت کر دیں۔ کیا ایسے حالات میں امام علیہ السلام خاموش رہتے اور تقیہ کے بہانے دین کی ہر پائمالی کو دیکھتے رہتے؟ جبکہ یہ سب حسین بن علیؑ جیسی ہستی سے بعید تھا اور پھر یزید نے امام حسین علیہ السلام کی موت و حیات کو اپنی بیعت میں منحصر کر دیا تھا۔ لیکن امام نے اس کے جواب میں فرمایا: وَمِثلِی لاٰ یُبٰایِعُ مِثلَه (52) یعنی ''مجھ جیسا، اس جیسے کی بیعت نہیں کرتا۔" پس امام علیہ السلام کا ایک ہی فیصلہ تھا کہ میں نے یزید کی بیعت نہیں کرنی چونکہ اس بیعت کا مطلب، تمام احکام دین کی پائمالی کو قبول کرنا ہے اور امام معصوم مفترض الطاعۃ کا یزید جیسے خلیفہ کی بیعت کرنے سے اسلام کا مٹ جانا یقینی تھا۔ اور جہاں یقین ہو جائے کہ ترک تقیہ سے اسلام مٹ جائے گا، تو وہاں تقیہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ وہ بھی امام معصوم کے لیے۔

۴۔ ان سب باتوں کے علاوہ حضرت امام حسین علیہ السلام جانتے تھے کہ اس معرکہ حق و باطل میں میری قربانی، مطلوب خداوند ہے اور یہ تقدیر الٰہی ہے کہ حق و حقیقت کے لیے ایک مقدس ترین ہستی اپنی جان کا نذرانہ پیش کرے۔ اور پھر بہت سی احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بھی امام حسین علیہ السلام کی شہادت اور بنی امیہ کی سرکشی کی پیش گوئی کی گئی تھی اور یہ ایک ایسی حقیقت تھی کہ جس کو خود امام حسین علیہ السلام نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: انَّ اللہ شٰاءَ اَن یَرٰانِی قَتیِلاً وَاَن یَرٰاهُنَّ سَبٰایاً (53) یعنی: "بتحقیق خداوند مجھے مقتول دیکھنا چاہتا ہے اور انہیں (مخدرات عصمت کو) اسیر''۔ پس امام حسین علیہ

السلام دین اسلام کی سربلندی اور حفاظت کے لیے تقدیر الٰہی کے اس فیصلے سے آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ فقط میری قربانی سے ہی اسلام بچ سکتا ہے۔ جب ایک شجاع شخص ایسے حالات سے دوچار ہو جائے تو اس کے لیے موت کوئی معنی نہیں رکھتی اور وہاں تقیہ جیسے مفاہیم اپنی اہمیت کھو دیتے ہیں۔ لہٰذا علم امام اور واقعہ کربلا کے بارے میں پیغمبر اسلامﷺ کے فرمودات کے بعد ترک تقیہ ہی بہترین راستہ تھا۔

۵۔ بالفرض، یہاں ہم تقیہ کو رخصت شرعی کے معنی میں بھی لیں تو بھی امام حسین علیہ السلام جیسی ہستی کہ جو ایثار و قربانی اور شجاعت و دلیری کا نمونہ ہے، رخصت کے بجائے شہادت ہی کو ترجیح دیتی کیونکہ امام عالی مقام نے وہی راستہ اپنانا تھا جو خداوند کے نزدیک زیادہ محبوب تھا اور آپ نے اسی فریضہ پر عمل کرنا تھا جو خدا کے نزدیک زیادہ فضیلت کا حامل تھا چونکہ رسول خداﷺ کا فرمان ہے: ''اَفضَلُ الاعمٰالِ اَحمَزُھٰا'' یعنی خداوند کے نزدیک افضل ترین کام وہ ہے جو زیادہ سخت ہے۔" اور پھر امام، خداوند کے فرمان: فَضَّلَ اللہ المُجٰاھِدِینَ عَلیٰ القٰاعِدینَ اَجرًاعَظِیماً (54) سے بھی آگاہ تھے اور فضیلت جہاد کو جانتے تھے لہٰذا ایسے حالات میں کہ جن میں اس وقت دنیائے اسلام گرفتار ہو چکی تھی، جہاد کرنا اور خدا کی راہ میں شہید ہو جانا ہی امام حسین علیہ السلام کے لیے زیادہ پسندیدہ تھا، نہ کہ تقیہ جیسی رخصت شرعی پر عمل کرنا اور پھر امام عالی مقام نے ایسا ہی کیا اور قیام و شہادت کو تقیہ پر ترجیح دے کر ہمیشہ کے لیے اسلام کے سچے پیروکاروں کا راستہ معین کر دیا کہ جب بھی احکام دین پر حرف آئے تو شرعی رخصت کے بجائے شہادت و فداکاری کا راستہ اپنانا زیادہ فضیلت رکھتا ہے کیونکہ رسول اکرمﷺ کا فرمان ہے: اِنَّ اللہ یُحِبُّ ان یُؤخَذَ بِرُخَصِة کَمٰا یُحِبُّ ان یُؤخَذَ بِعَزائِمِهِ (55) یعنی: "بتحقیق خداوند جس طرح اپنی رخصتوں پر عمل کو پسند فرماتا ہے اسی طرح اپنے قطعی احکام پر عمل کو بھی پسند کرتا ہے۔"

*****

## حوالہ جات

---

1۔الصحاح، (اسماعیل بن حماد جوھری)، مادہ وقی۔

2 ۔ کتاب المکاسب، ج ۳، ص ۱۲۷ (رسالۃ فی التقیۃ)

3۔ مؤمن (غافر)، آیت ۴۵۔

4۔آل عمران، آیت ۲۸۔

5۔ مجمع البیان، سورہ آل عمران ذیل آیہ ۲۸۔

6۔ تصحیح الاعتقاد الامامیہ، ص ۱۳۷۔

7۔کتاب المکاسب، ج ۳، ص ۱۲۷ (رسالۃ فی التقیۃ)۔

8۔ مجمع البیان، ج ۲، ص ۷۲۹۔

9۔التبیان، ج ۲، ص ۴۳۴۔

10۔القاعدۃ الفقہیۃ الامامیہ، ص ا۔

11۔ لتفسیر الکبیر، ج ۸، ص ۱۲۔

12۔فرہنگ اصطلاحات فقھی، ص ۱۴۔

13۔اصطلاحات الاصول، ص ۱۲۱۔

14۔ حکم ثانوی در تشریع اسلامی، ص ۲۰۶۔

15۔وسائل الشیعہ، ج ۱۶، ص ۲۱۴، باب امر بالمعروف و نہی عن المنکر، باب ۲۵، ح ۲۔

16۔کتاب المکاسب، ج ۳ (رسالۃ فی التقیہ)، ص ۱۲۹۔

17۔القواعد والفواعد، ج ۲، ص

18۔ایضاً

19۔ تفسیر الکبیر، ج ۸، ص ۱۲۔

20۔وسائل الشیعہ، ج ۱۶، ص ۲۲۲، کتاب امر و نہی، باب ۲۸، ح ۳۔

21۔الرسائل العشرہ (التقیہ)، ص ۳۴۔

---

22۔اصول کافی،ج۲،ص۱۲۳،کتاب ایمان و کفر، باب المدارا،ح۴۔

23۔ایضاً،ح۴۔

24۔وسائل الشیعہ،ج۱۶،ص۲۰۷،کتاب امر و نہی، باب ۲۴،ح۱۴۔

25۔سورہ آل عمران،آیت ۱۰۳۔

26۔الرسائل العشرہ (التقیہ)، ص۸۔

27۔الرسائل العشرہ،ص۹۔

28۔الرسائل العشرہ،ص۱۳۔

29۔ایضاً،ص۱۴۔

30۔وسائل الشیعہ،ج۱۶،ص۲۱۶،کتاب امر و نہی، باب ۲۵،ح۶۔

31۔ایضاً،ح۷۔

32۔ایضاً،ح۵۔

33۔ایضاً،ح۳۔

34۔جواہر الکلام،ج۲،ص۲۳۷۔

35۔دیکھئے سورہ بقرہ،آیت ۱۹۶۔

36۔دیکھئے سورہ بقرہ،آیت ۶۔

37۔تقیہ سپری برای مبارزۂ عمیق تر،

38۔جواہر الکلام،ج۲،ص۲۳۷، مرآۃ العقول،ج۹،ص۱۶۷۔

39۔وسائل الشیعہ،ج۱،کتاب الطھارۃ،ابواب وضو، باب ۳۸،ح۵۔

40۔جواہر الکلام،ج۲،ص۲۳۷۔

41۔وسائل الشیعہ،ج۱۶،ص۲۳۴،کتاب امر و نہی، باب ۳۱،ح۱۔

42۔السرائر،ج۲،ص۲۵۔جواہر الکلام،ج۲۲،ص۱۶۹۔

43۔وسائل الشیعہ،ج۱۶،ص۲۲۸،کتاب امر و نہی، باب ۲۹،ح۸۔

44۔ایضاً،ح۹۔

45۔ایضاً،ح۱۲۔

46۔الرسائل العشرہ (رسالۃ فی التقیہ)، ص۲۸۔

47۔وسائل الشیعہ، ج۱۶، ص۲۲۹، کتاب امر و نہی، باب۲۹، ح۲۔

48۔سورۂ بقرہ، آیت ۱۹۵۔

49۔وسائل الشیعہ، ج۱۶، ص۲۲۶، کتاب امر و نہی، باب۲۹، ح۳۔

50۔بحار الانوار، ج۵، ص ۲۴۲ (طبع قدیم)۔

51۔بحار الانوار، ج۴۳، ص۲۶۵۔

52۔سخنان حسین بن علی از مدینہ تا کربلا، ص۱۴۴۔

53۔ایضاً، ص۸۹۔

54۔سورہ نساء، آیت ۹۵۔

55۔وسائل الشیعہ، ج۱۱، ص۲۸۱۔

### عاشورا حسینی کے تناظر میں

# انسانی تکامل میں عورت کا کردار

# The Role of Woman in Human Evolution in the perspective of Ashura-e-Hussani

حجۃالاسلام جعفر خوارزمی

پاک و منزہ ہے ذات پرورد گا جس نے اپنے جمال و جلال کیساتھ کون و مکان کی تخلیق فرمائی۔ ہر ذرہ کو مناسب قطر و اندازہ عطاء فرمایا۔ کائنات کو اپنے حسن و جمال سے زیبائی عطاء فرما کر بہترین گھڑی میں دنیا کو انسانی حیات کے لئے تخلیق فرمایا۔ اس کو تمام تر زیبائیوں اور تازگیوں سے مالامال فرمایا۔ پھر خلّاق عالم نے اپنے ارادے سے انسان کی تصویر گری فرمائی اور اسے بہترین صورت عطاء فرمائی۔ پھر خود اپنے امر سے تن بے جان خاکی کو روح سے زندگی عطا فرمائی۔

لطیف و خبیر ہے وہ ذات جس نے نظام ہستی کی تخلیق، انسانی ضروریات کے مطابق فرمائی۔ اور اس سب کچھ کے بعد خلّاق عالم نے اپنی تعریف فرمائی کہ '' فتبارَکَ اللہُ اَحسَنُ الْخَالِقِین'' یعنی اللہ کی ذات پر آفرین ہے جو بہترین خالق ہے۔ قادر متعال نے اس دنیا میں انسان کی جسمانی اور روحانی ضرورتوں کو مکمل طور پر پورا فرمایا ہے۔ انبیاء عظام علیہم السلام اور اپنے آسمانی صحیفوں کے ذریعے انسان کی روحانی نشو و نما کا بندوبست فرمایا تا کہ انسان خاک سے افلاک کی جانب عروج حاصل کرسکے۔ در حقیقت انسان کی تخلیق کا مقصد بھی یہی ہے، جیسا کہ قرآن میں خدائے تعالی فرماتا ہے کہ ''وَمَا خَلَقْتُ الجِنّ وَ الانْسَ الاّ لیَعبدُون'' یعنی میں نے جن وانس کو صرف عبادت کے لئے خلق فرمایا ہے اور کوئی بھی عبادت بغیر عرفان و پہچان کے مکمل نہیں ہو سکتی۔ یعنی عبادت سے قبل معبود کی پہچان، اس کی عطا کردہ نعمتوں کی پہچان اور حق و باطل کی پہچان لازمی ہے۔ حتی معرفت سے متعلق زیارت کریمہ اہل بیت حضرت معصومہ قم (س) میں آیا ہے کہ '' ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ اپنی معرفت ہم سے سلب نہ فرمائیں۔'' اس سے واضح ہوتا ہے کہ عرفان و معرفت بھی عطاء و سلب ہو سکتی ہے۔

اسی ہدایت کی ایک کڑی انبیا اور دوسرے ائمہ طاہرین علیہم السلام ہیں۔ یہ سب انسان کی بھلائی اور تربیت و تعلیم کے لئے خدائے تعالی نے فراہم کیا ہے۔ اللہ تعالی نے انسان کو انبیا، ائمہ اور اپنے نیک بندوں کے ذریعے تربیت و تعلیم عطا فرمائی ہے۔ دین اسلام مرد و عورت کے لیے مساوات کا قائل ہے اور خدا کے نزدیک دونوں مساوی ہیں۔ قانون اور شریعت کے نزدیک بھی یہ دونوں مساوی ہیں۔ وہ چیز جو انہیں ایک دوسرے پر برتری دیتی ہے، ان کا اخلاق و کردار اور تقویٰ ہے۔ جیسا کہ قرآن میں رب العزۃ کا فرمان ہے: ''اِنّ اَکرَمَکُم عِندَ اللّٰہِ اَتْقٰیکُم '' بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے کریم اور بلند مرتبہ وہ ہے جو تم میں زیادہ با تقوی ہے۔

یعنی خدا کے ہاں معیار ایمان و عمل صالح ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو انسان کی شخصیت میں بے حد مئوثر ہے۔ متقی افراد اپنے اندر تمام وہ اوصاف جمع کر لیتے ہیں جو خدا نے انسانوں کے لیے پسند فرمائے ہیں۔ اولاد کی تربیت میں تمام نیک صفات کا ماں میں موجود ہونا اور ناپسندیدہ صفات سے بری ہونا نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولائے کائنات جناب امیر المومنین علی نے جناب فاطمہ زہرا علیہا السلام کی شہادت کے بعد جب دوبارہ عقد کرنا چاہا تو اپنے بھائی عقیل سے فرمایا کہ میرے لیے کسی دلیر خاندان سے زوجہ انتخاب کرو۔ تب جناب عقیل نے جناب فاطمہ ام البنین کا انتخاب فرمایا جن سے جناب عباس علمدار علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اس کا مطلب ہے کہ ماں کے اوصاف کا بچے کی شخصیت پر نہایت گہرا اثر ہوتا ہے۔ واضح ہو کہ انسان کی تربیت کا آغاز اس کے دنیا میں قدم رکھنے سے قبل ہو جاتا ہے۔ خدائے تعالی نے قرآن میں اس بارے میں فرمایا ہے:

" وَاللّٰہُ اَخرَجَکُم مِن بُطونِ اُمّھٰاتِکُم لٰا تَعلمُون شَیئاً وَ جَعلَ لکُم السّمْعَ وَ الٰابصارَ وَالاَفِئدۃَ لَعلّکم تَشکرُون" خدا نے تمہیں تمہاری ماؤں کہ بطن سے پیدا کیا جبکہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور جوارح قرار دیئے تا کہ تم شکر ادا کرو۔ (سورہ نحل ۷۸) گویا اس آیت میں رب کریم نے انسان کو توجہ دلا کر اسے اپنی عطا کردہ نعمتیں یاد دلائی ہیں۔ قوت سماعت، قوت بصارت اور اعضاء و جوارح کو ایک خاص ترتیب سے خلق فرمایا ہے۔ جس میں قوت سماعت کو قوت بصارت پر ترجیح دی ہے۔ حالانکہ انسان کے لئے دیکھنا، سننے سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن قرآن میں متعدد بار سماعت کو بصارت سے پہلے ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ سورہ انسان میں انسان کی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "اِنَّا خَلَقْنَا

الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا " ( سورہ انسان: آیت ۲ ) یعنی: ہم نے انسان کو اچھلتے ہوئے نطفہ سے خلق کیا تاکہ اسے آزمائیں۔ اسی لئے اسے سماعت و بصارت عطا فرمائی۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ خلقت انسان کے وقت جب بچہ ماہ کے بطن میں ہوتا ہے تو پہلے سننے کی قوت کا آغاز ہوتا ہے۔ ۴ ماہ کی عمر سے بچہ صاحب روح ہو جاتا ہے اور اسی وقت سے وہ آوازوں کو سننا شروع کر دیتا ہے، پھر پہچاننا شروع کرتا ہے۔ حتیٰ جدید علوم اور ٹیکنالوجی نے بھی اس بات کو ثابت کر دیا ہے۔ گذشتہ سال ۲۰۰۵ میں ایک امریکی تحقیقاتی ادارے National Geographic Society نے ایک جامع تحقیق انجام دی جس میں ایک حاملہ خاتون کو نو ماہ تک جدید آلات کے ذریعے ۲۴ گھنٹے زیر نظر رکھا گیا۔ ان ٹیسٹوں میں خوراک، ماحول اور ماں کے حالات کا بچے پر پیدا ہونے والے اثرات کا نہایت باریک بنی کے ساتھ جائزہ لیا گیا۔ اس دوران ایک آزمائش جسے کئی بار آزمایا گیا، وہ ماں اور بچے کے درمیان ایک خاص طرح کا رابطہ اور ہماہنگی تھی یعنی ماں اور بچے کے احساسات یکساں تھے۔

اگر ماں کسی چیز سے چونک جاتی یا خوف محسوس کرتی تو بچے پر بھی وہی اثر پڑتا۔ اسی طرح اگر کوئی چیز ماں کے مزاج کو پسند نہ آتی تو وہ بچے کو بھی نہ بھاتی۔ بچہ چار پانچ مہینے کی عمر سے ماں کی آواز پہچانتا ہے، ماں کے جذبات سمجھتا ہے، احساسات کا بخوبی ادراک کرتا ہے۔ در حقیقت بچہ ماں کی آنکھوں، کانوں اور احساسات کے ذریعے باہر کے ماحول کا ادراک کر رہا ہے۔ در ایں اثناء ماں کے ذریعے بچہ دوسرے افراد اور اشیاء سے تعارف حاصل کرتا ہے۔ انسان کی تربیت کا آغاز ماں کی گود سے ہوتا ہے جیسا کہ حدیث نبوی ﷺ میں ہے: " اُطْلِبُوا الْعِلمَ مِن المَهْدِ الٰی اللّحَد" گود سے گور تک علم حاصل کرو۔ اس کا مطلب ہے کہ ماں کی گود انسان کی سب سے پہلی درسگاہ ہے۔ بے شمار احادیث میں اہل بیت علیہم السلام نے فرمایا ہے کہ بچے کی دینی پرورش کا آغاز ان نو ماہ سے ہوتا ہے کہ جب وہ ماں کے جسم کا حصہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ بہت سے علماء کی زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ دو چیزوں کا ان کی تربیت میں بہت زیادہ اثر تھا: ایک ولادت سے قبل ماؤں کا دینی محافل میں شرکت کرنا، قرآن کریم سے انس اور آیات الٰہی کی باقاعدہ تلاوت اور دوسرا ولادت کے بعد بچے کو باوضو ہو کر دودھ پلانا۔ اکثر حافظان قرآن ایسے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں جن میں قرآن و مذہب کو اہمیت دی جاتی ہے۔ یعنی

بچے نے یا تو ماں کی آغوش میں یا پھر کمسنی میں تلاوت قرآن سنی ہے۔ اسی طرح رزق حلال بھی نیک اولاد کی پرورش میں نہایت مئوثر ہے۔

لیکن شیطانی قوتوں نے تاریخ میں انسانی اخلاق و کردار کو مسمار کرنے کی انتھک کوشش کی ہے اور اس دوران سب سے زیادہ ظلم خواتین پر ہوا ہے۔ کبھی عورت زندہ دفنادی جاتی، کبھی عورت کو زینت کا وسیلہ بنایا جاتا، کبھی عورت کو آزادی کے نام پر فساد و فحشاء کا نشانہ بنایا جاتا، کبھی عورت تمدن و ترقی کے نام پر ہوس کا نشانہ بنتی اور کبھی عورتوں کے نام پر مساوی حقوق کا نعرہ لگا کر سیاست بازوں نے انہیں ناپاک مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ یہ سب اس لئے ہوتا رہا کہ عورت کو ضعیف اور کمزور سمجھا جاتا تھا۔ زمانۂ جاہلیت کی مغربی اقوام میں تو عورت سے جانوروں سا سلوک کرتے تھے۔ عورت کو اپنی ملکیت سمجھتے اور اس کو اپنے گھریلو کام کاج کے لئے استعمال کرتے۔

نہ تو عورت کو حق انتخاب دیتے تھے اور نہ ہی انہوں نے اس کے لئے کوئی حقوق معین کیے تھے۔ جب چاہتے، اسے گھر سے نکال دیتے یا کسی کو بخ دیتے یا پھر غلاموں کی طرح اس کی خرید وفروخت کرتے۔ آج بھی مغربی تمدن میں عورت صرف ہوس اور مردوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ ایک صدی پہلے تک کسی عورت کو نہ تو وُوٹ دینے کا حق تھا اور نہ ہی اسے اپنے لئے کسی قسم کا حق انتخاب حاصل تھا۔ یہ اسلام ہی ہے جس نے عورت کو مقام بلند مقام و منزلت عطا کی ہے۔

الغرض معاشرے کی سب سے پہلی اور سب سے مئوثر درسگاہ ماں کی گود ہے جو ہر شخص کی تربیت، تزکیہ نفس اور اخلاق میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ تاریخ خود بہترین گواہ ہے کہ ہر کامیاب انسان کے ہمراہ ایک باکردار عورت کا ساتھ ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر ناکام انسان کے پیچھے بھی ایک بے کردار اور ناکام عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ خدا کے عظیم نبیوں، ائمہ اطہار، اولیاء اور اوصیاء کے ساتھ کم از کم ایک باکردار، قوی ہمت اور مضبوط ارادہ خاتون دکھائی دیتی ہے۔ جو ایک ماں، بہن، بیوی، پھوپھی یا خالہ کی صورت میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ نیک عورت خدا کی جانب سے نیک لوگوں کو ان کے نیک اعمال کا صلہ ہے۔

یہ ایک عطیہ الٰہی ہے۔ گویا خدا نے ارادہ فرما دیا ہے کہ ہر نبی ﷺ و امام بلکہ ہر صالح بندے کی پیدائش و تربیت عفیف و پاکدامن ماؤں کی گود میں انجام پائے گی۔ بلکہ یہاں تک ہے کہ بچے کی تربیت میں ماں کا کردار باپ کی نسبت زیادہ ضروری اور مئوثر بتایا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات

بچوں کی پیدائش باپ کی وفات کے بعد ہوئی، جیسا کہ بہت سے انبیاء کے ساتھ ایسا ہوا اور جیسا کہ جناب رسالتماب ﷺ کی تاریخ میں ملتا ہے۔ بلکہ حضرت عیسیٰ (ع) کی زندگی میں تو باپ کا وجود ہی نہیں لیکن خدا نے ثابت کر دکھایا کہ پیدائش و پرورش کے لئے ماں کا وجود نہایت ضروری ہے۔ عورت نہ صرف ایک فرد کی بلکہ ایک قوم وملت کی کردار سازی کرتی ہے۔

اسی لیے اسلام نے مردوں کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم کی خاص توجہ دلائی ہے بلکہ یکساں طور پر دونوں کی تعلیم کو فرض قرار دیا ہے۔ رسول اعظم اسلام ﷺ کا فرمان ہے : "طَلَبُ العِلمِ فَرِیضۃ علیٰ کلِ مسلمٍ و مسلمۃٍ" علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی تعلیم اسی حد تک ضروری ہے جس قدر مرد کی تعلیم۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عورت کی تعلیم کی اہمیت کسی لحاظ سے بھی نہ صرف مرد سے کم نہیں، بلکہ شاید کہیں زیادہ ہوتی ہے کیونکہ ایک مرد علم حاصل کرکے زیادہ سے زیادہ اپنے گھر کے لئے مفید واقع ہو سکتا ہے جبکہ عورت کی تعلیم کا اثر گھر و گھرانے سے بڑھ کر شہر و معاشرے تک پھیل جاتا ہے۔

ایک مہذب عورت ہی بہترین انسانی تہذیب و تمدن کی بنیاد رکھ سکتی ہے۔ ایک با کردار اور مضبوط ارادے والی عورت ہی دلیر قوم کو جنم دیتی ہے۔ ایک پرہیزگار و صاحب تقویٰ عورت ہی متقی و عبادت گزار بندے کی تربیت کرتی ہے۔ بالاخر یہ ماں ہی ہے جو ابتدا میں اپنے بچے کی تربیت کرتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے پروان چڑھنے کے لیے مناسب ماحول فراہم کرتی ہے۔ اپنے گھریلو ماحول اور معاشرے کی فضا کو اپنے اور دیگر بچوں کے لیے مہیا کرتی ہے۔ گویا جس معاشرے میں بھی تعلیم یافتہ خواتین کی کثرت ہوگی، وہاں نہ صرف گھر کا ماحول بلکہ معاشرہ بھی انسانی نشو ونما کے لیے نہایت سازگار ہوگا۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ انسان کا لباس اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے اسی طرح ایک پاک و پاکیزہ ماحول اور صاف ستھرا محلّہ وہاں بسنے والوں کی شخصیت کا مفسر و مبیّن ہوتا ہے۔ یعنی ایک صاف ستھری گلی، پاکیزہ در و دیوار اور مہذب لوگ پڑھے لکھے معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں۔

ایک مناسب تعلیم یافتہ اور مہذب خاتون گھریلو معاملات سے لے کر اہم اجتماعی امور تک میں قوم وملت کے لیے نہایت مفید و کارآمد واقع ہو سکتی ہے۔ عورت کو خدا نے سکون و آرام کا سبب بنایا ہے۔ یعنی عورت اپنے گھر میں اور معاشرے میں باعث سکون و آرام ہوتی ہے۔ قرآن کی سورہ روم کی آیت ۲۱

میں خدا فرماتا ہے کہ : " وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا " خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم میں سے ہی تمہارے لیے بیویاں خلق فرمائیں تاکہ تم ان کے ساتھ سکون حاصل کر سکو۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے مردوں کی تند خوئی کے مقابلے میں عورتوں کو نرم و لطیف مزاج عطا کیا ہے۔ عورت کو خدای تعالیٰ نے ایسا عظیم صبر و حوصلہ عطا فرمایا ہے کہ اس میں بڑی سے بڑی مشکل کو برداشت کرنے کی طاقت ہے۔ اسی طرح عورت اپنے حوصلے اور بردباری سے مسائل کو انتہائی دقت کے ساتھ حل کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ خدا نے اپنے جلال سے مردوں کو اور جمال سے عورتوں کو نوازا ہے۔

جدید تحقیقات کہ مطابق مردوں کی نسبت خواتین، دفاتر میں آفس سیکٹری کا کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتی ہیں کیونکہ ان میں غصّہ برداشت کرنے اور افراد کے درمیان اچھے روابط پیدا کرنے کی بھرپور توانائی ہوتی ہے۔ ایک مہذب عورت سے نہ صرف معاشرے میں لڑائی جھگڑے جنم نہیں لیتے بلکہ اس کا وجود معاشرے کو سکون و آرام مہیا کرتا ہے۔ تمام مسائل کا آغاز گھر میں اس نامناسب ماحول کی وجہ سے ہوتا ہے جب شوہر اور بیوی کے تعلقات خراب ہوتے ہیں۔ گھروں کے جھگڑے معاشرے میں نا امنی کا باعث بنتے ہیں اور یہ سلسلہ آگے چل کر قوم و ملت کے لیے عدم استحکام کا باعث بنتا ہے۔ لیکن اگر ابتدا ہی میں مسائل کو حل کر لیا جائے تو نہ صرف گھر اور معاشرہ ہر قسم کی تباہی سے محفوظ رہتا ہے بلکہ ایک خوشگوار ازدواجی زندگی بھی جنم لیتی ہے جو آئندہ نسلوں کی بہبود و سلامتی کی ضمانت ہوتی ہے۔ جس گھر میں بچے اپنے والدین کی مکمل توجہ اور محبت پاتے ہیں، ان کے وجود میں خود اعتمادی اور محبت جنم لیتی ہے۔

جن گھروں میں والدین کے مابین ناچاقی اور دشمنی پائی جاتی ہے، وہاں پرورش پانے والے بچے ذہنی توانائیوں سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ وقت خیالی دنیا میں گزارتے ہیں، جھوٹ بولنا سیکھتے ہیں، اخلاقی بے راہ روی کا شکار ہوتے ہیں، ناقابل اعتماد و ناقابل بھروسہ شخصیت کے مالک بن جاتے ہیں۔ نتیجتاً گھر میں بے توجہی اور بے حسی کی فضا کی وجہ سے انکی شخصیت مجروح ہو جاتی ہے اور پھر اسکول میں انہیں وہ سزائیں سہنی پڑتی ہیں جن کے وہ حقدار نہیں ہوتے۔ بچے اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہوئے والدین اور اساتذہ کو قصوروار سمجھتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کے لیے گھر اور اسکول کی فضا مکمل طور پر اجیرن بن جاتی ہے۔ ان تمام مشکلات کا سرچشمہ والدین اور خصوصاً ماں کا کردار ہے، جو آغاز ہی میں ان

تمام مسائل کو نہایت خوش اسلوبی سے حل کر سکتی ہے۔ یہاں پر یہ سمجھنا کہ عورت قربانی کا بکرا بن رہی ہے، سراسر غلط بلکہ نا سمجھی ہو گی۔ اس لیے کہ ایک پڑھا لکھا گھرانہ اپنے مسائل کو باہمی صلاح مشورہ سے حل کرتا ہے جس میں کبھی مرد اور کبھی عورت، معذرت کی پالیسی کو بروئے کار لاتے ہیں اور اگر ایک گھر، صرف ایک لفظ "معذرت" سے بچ سکتا ہے تو اس میں ہار کسی کی نہیں، بلکہ یہاں پر قابل قدر وہ ہے جس نے معذرت میں پہل کی ہو۔

البتہ یقیناً اگر ابتدا ہی سے گھرانے میں عشق و محبت کی فضا قائم ہو تو کبھی گھر کے افراد میں کسی قسم کا نقص واقع نہ ہوگا۔ ایک مہذب مذہبی گھرانے میں عورت ہی مرکزی کردار ادا کرتی ہے۔ درحقیقت ماں گھر کے افراد کو آپس میں متصل کرتی ہے اور ان کے درمیان مناسب انس و محبت برقرار رکھتی ہے۔ واضح سی بات ہے کہ جب کبھی افراد خانہ کے درمیان ایک دوسرے سے کم توجہی پیدا ہوتی ہے تو اس کے منفی اثرات پورے گھر پر رونما ہوتے ہیں۔ ماں اپنی مہربانی اور شفقت سے بھری ممتا کے ذریعے، جو اسے خداوند ارحم الراحمین کا خاص عطیہ ہے، گھر کو جنّت میں تبدیل کر سکتی ہے۔ یہی چیز اہلبیت اطہار علیہم السلام کے ہاں بھی ملتی ہے۔ رسول اعظم اسلام ﷺ نے ۲۴ ذی الحجۃ الحرام عید مباہلہ کے روز جناب فاطمہ زہرا علیہا سلام کو پنج تن کے درمیان میں قرار دے کر ثابت کر دکھایا کہ اہلبیت علیہم السلام کے درمیان محور و مرکز بی بی دو عالم حضرت فاطمہ علیہا السلام ہیں۔

درحقیقت مرد و عورت ایک دوسرے کے مکمّل ہیں یعنی مرد کے بغیر عورت نامکمل ہے اور عورت کے بنا مرد۔ اسی لیے خالق یکتا و علیم نے مرد و عورت کو دو مختلف مزاج عطاء کیے ہیں تاکہ دونوں مل کر ایک پُرمحبت و روح فنزا ماحول کی تشکیل کر سکیں اور جس میں اعلی انسان نشو و نما پا سکیں۔ قرآن کریم میں خدا نے مرد و عورت کو ایک دوسرے کا لباس تعبیر کیا ہے جہاں سورہ بقرہ ۱۸۷ میں فرماتا ہے: هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ یعنی: "وہ تمہارے لیے لباس اور تم ان کا لباس ہو۔" یعنی تم ایک دوسرے کے عیوب کی پردہ پوشی کرتے ہو۔ گویا کہ دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ خدا نے مرد کو گھر سے کے دشوار امور انجام دینے کے لیے اور عورت کو اندرون خانہ امور نمٹانے کے لیے بنایا ہے۔ جیسا کہ احادیث میں بھی اشارہ ملتا ہے کہ جناب رسول اعظم اسلام ﷺ نے جناب سیدۃ النساء العالمین فاطمہ زہرا علیہا السلام اور جناب امیر المومنین علی علیہ السلام سے نکاح کے موقع پر ان سے فرمایا: "یا علی۔ گھر

سے باہر کے امور آپ کے ذمہ اور درون خانہ کی ذمہ داریاں فاطمہؑ کے سپرد'' اس موقع پر دُختر رسولﷺ جناب بتول(س) نے اظہار مسرّت فرمایا۔

جیسا کہ جب جناب فاطمہ علیہا السلام سے پوچھا گیا کہ ایک عورت کے لیے کیا چیز باعث سعادت ہے؟آپ نے فرمایا''نہ کوئی (نامحرم) اسے دیکھے اور نہ وہ کسی (نامحرم) کو دیکھے۔" البتہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خواتین معاشرے میں کوئی نقش نہ چھوڑیں اور اپنا مثبت کردار ادا نہ کریں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت عفت و طہارت کے حجاب میں رہتے ہوئے اپنا کردار ادا کرے۔ جناب بتول علیہا سلام کے اس کلام کا مقصد معاشرے میں عورت کا مقام محفوظ رکھنا اور حوس و شہوت کا سد باب کرنا ہے۔ حجاب کی حکمت بھی دراصل یہی ہے کیونکہ عورت کا حسن و جمال صرف اس کے شوہر کے لیے مخصوص ہے اور اس کا شیریں لب و لہجہ اور لطیف مزاج اولاد کی بہتر تربیت کے لیے بنا ہے۔ تمام آسمانی و الہی خواتین نے ہمیشہ اپنے زمانے کے اولیاء اور اوصیاء الہی کی مدد و نصرت کی ہے۔

اسلام میں بھی پہلی عظیم خاتون اسلام جناب خدیجۃ الغرّاء نے اسلام کے ابتدائی دور میں اپنے مال سے دین اسلام اور مسلمانوں کی مدد و نصرت فرمائی اور اپنی شفقت و مہربانی سے رسول اللہﷺ کو دلجوئی اور حوصلہ دیا۔ اسی طرح سیدۃ النّساء العالمین جناب فاطمہ زہراء علیہا سلام نے بھی جنگوں اور غزوات میں دیگر مسلمان خواتین کے ہمراہ زخمیوں کی تیمار داری کے فرائض انجام دیے ہیں اور اسی طرح جب ضرورت پیش آئی تو امامت و ولایت جناب امیر المومنین علی علیہ السلام کے دفاع کے لیے اور امت کو صحیح راستہ دیکھانے کے لیے چادر عصمت اوڑھ کر انصار و مہاجرین کے یہاں گھر گھر جا کر انہیں غدیر خم میں بیعت مولا علی یاد دلائی۔ یہاں تک کہ بھری مسجد میں مسلمانوں کے سامنے لب و لہجہ رسولﷺ میں وہ عظیم تاریخی و یادگار خطبہ بیان کیا جس سے تاریخ پر حقیقت ہمیشہ کے لیے آشکار ہو گئی۔ حتیٰ وقت آنے پر جناب سیدہ علیہا سلام نے امامت و ولایت کی حفاظت میں اپنی جان تک قربان کر دی۔

جناب فاطمہ زہرا کی گود میں پرورش پانے والی ثانی زہراء محافظہ انقلاب عاشورہ زینب علیہا سلام نے بھی دوران زندگی میں اپنے حجاب کی قداست کو قائم رکھتے ہوئے معاشرے میں خواتین کی تعلیم و تربیت کا مقدس کام جاری رکھا۔ امیر المومنین علی کے دوران حکومت میں جناب زینب علیہا سلام نے شہر کوفہ میں ۲۰۰۰ سے زائد خواتین اور بچیوں کے لیے تعلیمی سلسلہ کا انعقاد فرمایا اور اور آپ بذات خود بچیوں اور

خواتین کو قرآن کریم کی تعلیم دیتی تھیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس عظیم مخدرہ نے، کہ جن کو حتی کہ بنی ہاشم نے بھی کبھی دن میں گھر سے باہر نہ دیکھا اور نہ ہی نامحرموں نے کبھی آپ کی آواز سنی تھی، صرف اور صرف مکتب اسلام اور انقلاب حسین کی پاسداری کی خاطر، کوفہ کے بازار اور دربار شام میں علی کے لب و لہجہ میں ایمان افروز خطبے بیان کیے اور اسلام کے وجود کو تازہ روح بخشی۔

اگر عظیم با کردار ماؤں کی تربیت نہ ہوتی تو ان مصائب کا برداشت کرنا ناقابل تصور تھا۔ یہ محسنہء دین، جناب خدیجہ علیہا سلام کا دامن تھا اور یہ مظلومہء تاریخ، جناب فاطمہ زہرا علیہا سلام کی پاکیزہ آغوش ہی تھی جن سے حسنین علیہما السلام اور زینبین علیہما السلام جیسے گوہر وجود میں آئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے زمانے کے محی الدین والاسلام امام خمینی، جنہوں نے اپنے انقلاب کو انقلاب کربلائے حسینی سے متصل کرکے مسلمانوں کو ایک نیا جوش اور ولولہ عطاء کیا، اپنے ایک نہایت اہم اور تاریخی کلام میں جناب فاطمہ زہرا علیہا سلام کی تعریف میں فرماتے ہیں:

"تمام کمالات جو کسی عورت یا انسان میں تصور کیے جاسکتے ہیں، وہ سب یکجا جناب فاطمہ کی شخصیت میں نمایاں تھے۔ حضرت زہرا کوئی معمولی شخصیت نہیں تھیں۔۔۔ وہ ایک روحانی ہستی تھیں۔۔۔ ایک ملکوتی ہستی۔۔۔ صحیح معنوں میں انسان کامل۔۔۔ مکمل انسانی شخصیت ۔۔۔ حقیقتاً ایک کامل خاتون۔۔۔ حقیقتاً کامل انسان۔ وہ ہرگز عام معمولی انسان نہیں تھیں بلکہ ایک ملکوتی ہستی تھیں جو انسان کے روپ میں دنیا میں جلوہ افروز ہوئیں۔۔۔ ایک ایسی الہی اور جبروتی ہستی جو عورت کے روپ میں ظاہر ہوئیں۔ ان میں تمام انبیاء کے اوصاف موجود تھے۔۔۔ ایسی خاتون، کہ جو اگر مرد ہوتیں تو نبی ہوتیں۔۔۔ جو اگر مرد ہوتیں تو رسول اللہ کے مقام پر فائز ہوتیں۔"

کس قدر فاصلہ ہے ہماری پہچان میں۔۔۔ ہماری معرفت میں۔۔۔ ہماری سوچ میں ۔۔۔ اور کس قدر خلوص کا فقدان ہے ہمارے ایمان اور ہمارے عمل میں۔ کیا ان ہستیوں کو ٹھیک سے پہچانے بغیر کوئی بھی عمل مکمل ہوسکتا ہے؟!!

تربیت کے موضوع میں سب سے زیادہ اہمیت ماں کے کردار کی ہے اور افسوس کی بات ہے کہ اس موضوع میں سب سے زیادہ ظلم عورت پر ہوا ہے۔ حتی کہ ہمارے دینی گھرانوں میں، بجائے اس کے کہ دین کو صحیح طریقے سے اور صحیح ذرائع سے حاصل کرتے، نہایت افسوس کا مقام ہے کہ اس موضوع پر

بے جا تعصب کی وجہ سے شاید بالکل ہی توجہ نہیں دی گئی جس کے نتیجہ میں نسلوں کی نسلیں برباد ہو کر رہ گئیں۔ البتہ اس مقام پر کسی خاص فرد یا گروہ کو قصوروار ٹھہرانا مقصود نہیں، بلکہ موضوع کی اہمیت اجاگر کرنا مقصود ہے۔ شاید آسان ترین راستہ یہ ہوگا کہ یہ دیکھا جائے کہ ایران کا انقلاب اس زمانے میں کیسے کامیاب ہو گیا؟ ہمیں لبنان میں بار بار فتح کیسے نصیب ہوئی؟

پوری تاریخ میں کہیں کوئی ایسی فتح دکھائی نہیں دیتی جس میں خواتین کے مضبوط ارادوں کے بغیر مردوں کو کچھ حاصل ہوا ہو۔ اسلام کے آغاز کی سختیوں میں ام عمار کی دلیرانہ شجاعت نظر آتی ہے، ہجرت حبشہ میں جناب ام حبیبہ نظر آتی ہیں اور شعب ابیطالب میں جناب خدیجہ نمایاں دیکھائی دیتی ہیں۔ اسی طرح جناب فاطمہ زہراؑ جنگ بدر کے معرکے سے لے کر کبھی احد کے میدان میں تو کبھی خندق کے حصار میں ہر جگہ مردوں کے شانہ بشانہ کہیں زخمیوں کی تیمارداری، کہیں مردوں کو رجزخوانی کے ساتھ حوصلہ دیتی ہوئی اور وقت آنے پر ہاتھوں میں ہتھیار لے کر رسول اللہ ﷺ کی جان کی حفاظت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کبھی آپ امامت کے دفاع میں گھر سے باہر نکل آتی ہیں۔ اگر لوگ امیر المومنین کو زبردستی مسجد لیجانے آتے ہیں تو بی بی نہ صرف مخالفت کرتی ہیں بلکہ عملی طور پر دشمن سے اظہار دشمنی فرماتی ہیں اور اپنے آخر حیات تک مدینے والوں سے ناراض رہ کر اپنی استقامت اور مخالفت کا اظہار فرماتی ہیں۔

اسی طرح کربلا میں جناب زینب علیہا سلام نے قافلہ سالار بن کر دنیا کی خواتین کو ایک بار پھر اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا۔ انصاف تو یہ ہے کہ کوئی سوچ اور قلم اس شجاعت و استقامت کو بیان نہیں کر سکتی جو امیر المومنین کی صاحبزادی جناب زینب (س) نے حادثہء کربلا میں دکھائی، کہ اگر وہ مصائب پہاڑوں پر گرتے تو انہیں پاش پاش کر دیتے، اگر زمین پر برستے تو اسے ویران کر دیتے اور اگر دریاؤں پر جاری ہوتے تو شدت حرارت سے انہیں خشک کر دیتے، لیکن قافلہ سالار اسیران کربلا جناب زینب کبریٰ شجاعت اور استقامت کے ساتھ اپنے مقصد پر ثابت قدم رہیں۔ اگرچہ مشیت الہی میں مومنین اور صالحین کو آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ جناب ابراہیم خلیل اللہ، اپنے زمانے کے نمرود سے بے شمار بحث و جدال کے بعد آخر کار آتش نمرود کے ذریعے آزمائے گئے جسے خدا نے آپ کے لیے گلستان بنا دیا۔ پھر اس کے بعد جناب ابراہیم ، ہاجرہ اور اسماعیل سے جدائی کے ذریعے آزمائے گئے اور بالآخر ایک دن

اپنے اکلوتے فرزند اسمٰعیل کو ذبح کرنے کے حکم سے آزمائے گئے۔ جب جناب ابراہیم تمام آزمائشوں پر پورا اترے تو خدا نے انہیں مقام امامت عطا فرمایا۔

پھر انبیاء میں سے جناب ایوب نہایت دشوار آزمائشوں سے آزمائے گئے، انہوں نے ان تمام آزمائشوں پر صبر کیا اور یوں صبر ایوب زباں زدِ خاص و عام ہو گیا۔ خود جناب سید الشّہداء امام حسین (ع) نے بھی صبح عاشور سے ظہر تک شدید آلام و مصائب برداشت کئے، ظہر سے لے کر عصر عاشور تک اپنے جگر گوشوں اور معزز اصحاب رسول ﷺ کو اپنی نگاہوں کے سامنے قربان ہوتے دیکھا اور آخر میں ذبح عظیم کی تفسیر اپنے خون مبارک سے فرمائی لیکن امام حسینؑ نے دین کی حفاظت اور پیغام کربلا کو بہتر طریقے سے ہر جگہ پہنچانے کی خاطر اپنی خواتین اور بچیوں کو ساتھ لا کر حادثہء عاشورہ کو مزید دلخراش بنا دیا۔ جب امام حسینؑ سے پوچھا گیا؛ ''آپ اپنے ساتھ عورتوں اور بچوں کو کیوں لے کر جا رہے ہیں؟''آپ نے فرمایا: ان کو میرے ساتھ ضرور جانا ہے۔'' در حقیقت جناب سّید الشّہداءؑ نے ایسے شجاع اور با استقامت مبلغین کو انتخاب کیا تھا کہ جو آپ کی شہادت کے بعد دشمن کے قلب یعنی شام و کوفہ پر کاری ضرب لگا سکیں۔ در حقیقت یہ امام حسینؑ کی ایک نہایت ہی گہری اور عمیق جنگی حکمت عملی تھی۔

امام حسین کی اسی نہج کو مد نظر رکھتے ہوئے بانی انقلاب اسلامی امام خمینی نے فرمایا: ''۱۵ خرداد ۱۳۴۲ شمسی (۱۹۶۳ء) کی تحریک کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ اس میں خواتین کا کوئی کردار نہیں تھا۔''اور ۲۲ بہمن ۱۳۵۷ شمسی (۱۹۷۸) میں انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی سے متعلق متعدد بار فرمایا: '' انقلاب کی کامیابی میں ہماری خواتین کا بنیادی کردار تھا۔ اگر وہ مردوں سے آگے نہ ہوں تو اُن سے پیچھے بھی ہر گز نہیں تھیں۔'' یہ حکمت عملی امام خمینی نے اپنے سرور و سالار امام حسین سے سیکھی تھی اور آپ معتقد تھے کہ مسلمانوں کی فتح و کامیابی کا راز عاشورہ کو اس کے تمام زاویوں کے ساتھ زندہ رکھنے میں ہے۔ انقلاب حسینی اور حماسہء عاشورہ میں جس شخصیت نے سب سے بڑھ کر امام حسین (ع) سے نورانیت حاصل کی اور آپ سے بہترین درس حاصل کیا، وہ جناب سیدہ زینب سلام اللہ علیہا تھیں جیسا کہ فارسی زبان میں ایک مشہور شعر ہے:

ترویج دین اگرچه به قتل حسین شد تکمیل آن به موی پریشان زینب است

یعنی اگرچہ دین کی ترویج امام حسینؑ کے خون سے ہوئی لیکن اس کی تکمیل بی بی زینبؑ کے پردہ چھننے نے کی۔

حقیقتاً عجیب ماجرا ہے۔ زینب جو دامن علی و زہرا میں پروان چڑھی ہیں۔ جنہوں نے کبھی دن میں مدینے کے گلی کوچوں کو نہ دیکھا تھا۔ کس قدر مظلومیت ہے کہ وہ اب کربلا میں کیا کیا کچھ سہیں گی۔ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جناب زینبؑ کی شخصیت نے کربلا کے بعد مزید عظمت اور وقار حاصل کرلیا۔ یعنی کربلا سے پہلے والی زینب اور بعد والی زینبؑ میں فرق ہے۔ کربلا میں ہم دیکھتے ہیں کہ بی بی زینبؑ ایک دو بار پریشان اور مضطرب ہوئیں اور رونے پر قابو نہ پا سکیں۔ یہاں تک ایک مرتبہ اس قدر روئیں کے دامن حسین (ع) میں غش کھا گئیں لیکن حسینؑ نے آرام آرام سے اپنی بہن کو دلاسہ دیا۔ زینبؑ۔ دامن صبر کو ہاتھ سے مت جانے دو۔ وسوسوں کو نزدیک نہ آنے دو۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ میرے ناناﷺ جو مجھ سے بہتر تھے، وہ بھی اس دنیا سے چل بسے۔ میرے بابا ، میرے بھائی اور میری مادر بھی اسی طرح چلے گئے۔ اس وقت جناب زینبؑ نے فرمایا: ''بھائی حسینؑ: جب وہ سب گئے تو میری کوئی پناہ تو تھی لیکن آپ کے بعد میرا کون ہے؟''

لیکن جوں ہی عاشور کے دن ڈھلتا ہے۔ جناب زینبؑ کی شخصیت تبدیل ہو جاتی ہے اور حسین کا وقار اور عظمت آپ میں دکھائی دینے لگتا ہے۔ یہ چیز ہمیں ایران میں دکھائی دیتی ہے کہ جہاں صدّام کے خلاف جنگ میں مائیں اپنے بچوں کو جنگ کے لیے روانہ کرتی تھیں اور فطرتاً بعض مائیں پریشان بھی ہوتی تھیں لیکن جب ان اپنے بچوں کی شہادت کی خبر موصول ہوتی اور ساتھ میں شہید کی وصیت ملتی کہ'' میرے جنازے پر گریہ نہ کرنا بلکہ اگر کبھی رونا چاہو تو حسینؑ کی مظلومیت پر رو لینا یا اگر میری جوانی کی یاد آئی تو حسینؑ کے علی اکبرؑ کو رو لینا۔ کبھی امام خمینیؒ کو تنہا نہ چھوڑنا اور ہمیشہ اپنا جان مال ان کے لیے قربان کرنا کیونکہ وہ نائب امام زمانؑ ہیں۔"

یہ سُن کر مائیں اپنے ہاتھ آسمان کی جانب بلند کرتیں اور دعا کرتیں "خدا ہماری قربانی قبول فرما"۔ پھر خود بھی کوشاں نظر آتیں کہ اپنے ہاتھوں سے مجاہدین کے لیے مختلف اشیاء خورد و نوش کی جمع آوری اور ارسال میں مدد کریں۔ گویا اپنے فرزندوں کے گرے ہوئے پرچم اپنے ہاتھوں سے بلند کرتیں۔ یہ دلیری اور یہ شجاعت مکتب حسینؑ کی ہے جو ان ماؤں نے جناب زینبؑ سے پائی ہے۔ یعنی اگر مردوں نے حسینی کام کیا تو عورتوں نے زینبی کام کر دکھایا۔ بلکہ گھروں میں خواتین مشعل بردار انقلاب تھیں یعنی خواتین

کے ذریعے انقلاب گھروں کے اندر داخل ہوا۔ غرض یہ ہوا کہ جناب زینبؑ واقعہ کربلا کے بعد پہلے کی نسبت تبدیل ہو گئیں۔ اب آپ کے آگے کسی مستکبر کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

جناب امام سجادؑ فرماتے ہیں؛ "ہم بارہ افراد تھے جنہیں ایک ہی زنجیر سے باندھا گیا تھا۔ زنجیر کا ایک سرا میرے بازو میں اور دوسرا سرا میری پھوپی زینبؑ کے بازو میں تھا۔'' کہتے ہیں کہ اسیران اہل بیت دو صفر کو دمشق میں داخل ہوئے۔ اس کا مطلب ہے کہ شام میں داخلے کے وقت جناب زینبؑ کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے ۲۲ دن بیت چکے تھے۔ آپ نے ۲۲ دن اسیری کی سختیاں برداشت کیں اور اس حال میں انہیں یزید بن معاویہ کے دربار میں حاضر کیا گیا۔ وہ دربار جسے معاویہ نے تعمیر کروایا تھا جو قلعہ اخُضَر یعنی سبز قلعے کے نام سے مشہور تھا اور جس کا شکوہ و دبدبہ اور جس کی رعنائیاں ہر دیکھنے والے کو مسحور کر دیتی تھیں۔

اس حال میں اسیروں کو لایا گیا۔ جناب زینب کبریٰ رنجور اور غم زدہ جب اس محفل یزید میں داخل ہوئیں تو آپ کے رعب و وقار سے محفل پر ایک عجیب دہشت چھا گئی یہاں تک کہ یزید جس کی فصاحت و بلاغت مشہور تھی، گونگا ہو گیا۔ پھر اس محفل میں بنت علیؑ نے ایسا فصیح و بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا کہ یزید پر موت کا سکتہ طاری ہو گیا۔ یزید اس بے آبروئی سے بچنے کے لیے احمقانہ کوششیں کرتا رہا لیکن جناب زینب کبری علیہا سلام اسی طرح مضبوط اور مستحکم ارادے کے ساتھ مضبوط کھڑی رہیں۔ امام خمینیؒ اپنے ایک خطاب میں شہر قم مقدسہ کی خواتین سے فرماتے ہیں:

> "آپ خواتین نے ثابت کر دکھایا ہے کہ آپ پیش قدمی کی حامل ہیں۔ آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ مردوں سے آگے پیش پیش ہیں۔ مرد حضرات آپ سے الہام حاصل کرتے ہیں۔ ایرانی مردوں نے خواتین سے تعلیم پائی، خواتین سے سیکھا ہے، اور قم کے مرد حضرات نے آپ سے تربیت حاصل کی اور تعلیم پاتے ہیں، آپ خواتین اس تحریک میں پیش پیش ہیں۔۔۔''

آگے فرماتے ہیں؛ '' میں آپ سب کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس قیام میں شرکت فرمائی، اُن تمام ماؤں کا بھی جنہوں نے اس راہ میں اپنے فرزند قربان کیے اور اس ماں کا بھی جس نے ایک شہید دینے کے بعد کہا کہ میں اپنے دوسرے بیٹے کو بھی قربان کروں گی۔'' یہ افکار اور یہ سیرت و کردار سارے کے

سارے کربلائی و عاشورائی ہیں۔ آیا تاریخ بنانے میں مردوں کا کردار ہے یا عورتوں کا، اس سے متعلق تین قسم کے نظریات پائے جاتے ہیں۔

۱۔ تاریخ میں بنیادی کردار صرف مرد کا ہے اور خواتین کا کوئی کردار نہیں۔

۲۔ مرد و عورت دونوں کا ملا ہوا کردار ہے۔ یعنی کبھی مرد عورت کی جگہ لے لیتا ہے اور عورت مرد کی جگہ۔ جیسا کہ بعض اوقات مرد عورتوں کی ذمہ داریاں سنبھال لیتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مرد بچے سنبھالتا ہے اور عورت کاروبار کرتی ہے۔ در حقیقت مرد و عورت ایک دوسرے کے دائرہء اختیار میں داخل ہو جاتے ہیں۔

۳۔ مرد و عورت تاریخ کی تشکیل میں دونوں برابر اہمیت رکھتے ہیں لیکن مرد اپنے حدود و اختیارات میں اور عورت اپنے حدود و اختیارات کے اندر۔ جب ہم قرآن کریم میں تاریخ کو دیکھتے ہیں تو ہمیں دین و مذہب میں مرد و عورت دونوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ جیسا کہ شہید مرتضی مطہری فرماتے ہیں: تاریخ مذنّث یعنی مذکر و مونث دونوں کی شمولیت تشکیل پاتی ہے لیکن ایک دوسرے کہ اختلاط کے ذریعے نہیں بلکہ ہر کسی کو اپنی حدود ہیں کو رکھتے ہوئے۔ تاریخ کربلا، در حقیقت ایک تذکیر و تانیث سے تشکیل پایا ہوا تاریخی حادثہ ہے۔ یہ ایسی تاریخ ہے جس میں مرد و عورت، دونوں کی نقش آفرینی ہے اور دونوں نے صبر اور شجاعت کے ساتھ اپنی ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے قیام کیا ہے۔ اسی لیے حضرت ابا عبد اللہ الحسین نے اپنے اہل بیت کو اپنے ہمراہ لیا ہے کیونکہ ان کی بھی اس تاریخی واقعے میں ایک عظیم ذمہ داری ہے۔ انہوں نے بلا واسطہ اس تاریخ کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ انہوں نے جناب زینب کبریٰ علیھا سلام کی سپہ سالاری میں اور اپنی تانیثی حدود سے خارج ہوئے بغیر اپنے نقوش چھوڑنے ہیں۔

ایرانی خواتین نے بھی کربلا کی خواتین کی تقلید و پیروی میں دوران انقلاب بھی اور صدام کی آغاز کردہ جنگ میں بھی، خود اپنے مردوں اور جوانوں کو میدان کارزار کے لیے آمادہ کیا اور بعد شہادت بھی صبر کا جام نوش کرکے قافلہ سالار شام کی طرح شہداء کے مشن اور مقاصد کے پرچار کی خاطر سرگرم عمل ہو گئیں۔ اس مقام پر امام خمینیؒ کا قول یاد آتا ہے کہ آپ فرماتے ہیں؛

'' ہمیں جتنی بھی کامیابیاں نصیب ہوئی ہیں، ان کے لیے ہم مردوں کی نسبت خواتین کے زیادہ مرہون منت ہیں۔ ہماری خواتین ہمیشہ اگلی صفوں میں پیش پیش رہی ہیں۔ ہماری خواتین مردوں میں جرات و

شجاعت کا سبب بنی ہیں۔ ہم، آپ خواتین کی زحمتوں کے مرہون منت ہیں اور ہمیشہ آپ کے لیے اور پوری ملّت کی سربلندی کے لیے دعا گو ہیں۔'' جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا ہے کہ کربلا میں مرد و عورت، ہر کوئی اپنے حدود و اختیار کے دائرے میں ذمہ داری انجام دے رہا تھا۔اسی طرح جناب زینب کبریٰ علیہا سلام نے بھی عصر عاشورہ کے بعد سے تجلّی فرمائی۔

در حقیقت کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ابا عبداللہ الحسین علیہ السلام کا قیام دو حصوں میں انجام پذیر ہوا ہے۔ پہلا حصہ امام حسینؑ کی شہادت کے ساتھ ختم ہوا اور دوسرا حصّہ، جو دراصل پہلے حصّے کا ہی تسلسل تھا، صبر و استقامت کی بے مثل مثال ثانی زہرا جناب زینب کبریٰ علیہا سلام کی قافلہ سالاری سے آغاز ہوا۔ وہ قافلہ، جو کربلا کو فتح کرنے کے بعد اب صرف چند عورتوں، بچوں اور ایک بیمار مرد پر مشتمل تھا اور یہ سب کے سب اپنا کوئی نہ کوئی عزیز خدائی قربانگاہ میں فدیہ دے کر آئے تھے ان سب کے درمیان جناب زینبؑ کا غم سب سے فزوں تر تھا۔

تمام شہیدوں کا غم دل میں سمیٹتے ہوئے،

دوسروں کو حوصلہ دیتے ہوئے،

بیمار کربلا کی تیمار داری کرتے ہوئے،

منصب امامت کی حفاظت کرتے ہوئے،

بیواؤں کو ہمت دیتے ہوئے،

معصوم یتیموں کے آنسو پونچھتے ہوئے،

اور امام حسینؑ اور شہداء کربلا کی قربانیوں کے مقاصد کو زندہ کرتے ہوئے،

وقار مصطفوی ﷺ، شجاعت حیدری اور غیرت فاطمی کے ساتھ ؛

جناب زینب کبریٰ یہ قافلہ لے کر شام کو فتح کرنے چلیں۔

اس قافلے میں تنہا مرد سید السّاجدین امام زین العابدینؑ تھے جو روز عاشورہ سے اللہ کے حکم سے بستر بیماری پر تھے جبکہ حاکم کوفہ ابن زیاد کا حکم تھا کہ کسی مرد کو زندہ باقی نہ رہنے دیا جائے۔ اگرچہ کئی مرتبہ دشمنان خدا نے امام کو قتل کرنا چاہا لیکن جناب زینب کبریٰؑ کی شجاعانہ اور دلیرانہ استقامت کے آگے بے بس ہو گئے۔

جناب زینب کبریٰ علیہا سلام نے دوران سفر امام زین العابدینؑ کی تیمار داری کرکے در حقیقت نسل امامت کی حفاظت فرمائی۔ یہ شجاعت اور دلیری در حقیقت جناب علی و زہرا علیہم السلام کی تربیت و تعلیم کا ثمرہ تھا۔
سب سے پہلی مجلس عزا جناب سیدہ زینب کبریٰ علیہا سلام نے گیارہ محرم الحرام کو مقتل و معراج شہداء کربلا میں برپا کی۔ اسیران و ناموس اہلبیت کو بے کجاوہ اونٹوں پر سوار کیا گیا۔ جناب زینب کبریٰ نے تمام یتیموں اور بیواؤں کو سوار کیا۔ امام صبر و استقامت امام زین العابدینؑ کو بھی سوار کیا۔ بیماری کی وجہ سے امام کے پیر اونٹ کے شکم سے باندھ دیے گئے۔ قافلہ اور جلے ہوئے خیام حسینی سے چلا۔ جیسے ہی مقتل سید الشّہداء کے قریب پہنچا تو تمام اسیروں نے اونٹوں س کو چھوڑ کر خود کو خاک کربلا پر گرا دیا۔ وہ سب سید الشّہداء کے بدن اطہر کے گرد جمع ہو گئے۔ انہوں نے نواسہء رسولؐ، جگر گوشہء بتول کو ایسی حالت میں دیکھا جو کبھی انہوں نے سوچی بھی نہ تھی۔ امام عشق کا بے لباس، سر بریدہ اور زخموں سے چور بدن نظر آیا جسے بدن میں ٹوٹ چکے تیروں، نیزوں اور پتھروں نے ڈھانپ لیا تھا۔ اس وقت جناب زینب کبریٰ نے خود کو بھائی کے بدن پر گرا دیا اور اس قدر شدید آہ و نالہ کیا "فَاَبْکَت کُلّ عَدُوٍ وَ صَدِیقٍ" جس سے ہر دوست و دشمن رونے لگا۔ عصر عاشورا شہادت حسین بن علیؑ کے بعد جناب زینب کبریٰ نے فرمایا؛
''ربّنا تقبّل مِنّا هذا القليل" ہمارے پالنے والے ہم سے یہ بہت تھوڑا قبول فرما۔''
امام خمینیؒ کربلا کے حقائق کے مقاصد کو مد نظر رکھتے ہوئے اور مجالس و نوحہ و ماتم کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''مجالس کے گہرے اور عمیق اثرات سے اکثر لوگ ناواقف ہیں، اور بعض تو اسے بے اہمیت سمجھتے ہیں۔ یہ جو ہماری احادیث میں ایک قطرہ اشک بہانے اور تباکی (یعنی رونے کی صورت بنانے) کی اس قدر اہمیت اور ثواب بیان ہوا ہے، اس کی وجہ ہر گز یہ نہیں ہے کہ امام حسینؑ اپنے شیعوں کے اشک و نالہ و ماتم کے منتظر ہوں، بلکہ اس ثواب کے بیان کا اصل مقصد انقلاب عاشورا کو زندہ رکھنا ہے۔'' ایک اور جگہ پر امام خمینیؒ تاریخ انقلاب اسلامی کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں، ''پہلی مرتبہ جب حکومت شاہ کے کارندے مجھے قم سے گرفتار کرکے گاڑی میں لے جا رہے تھے تو انہوں نے کہا'' ہم آتے ہوئے ان کالی چادروں سے (انقلابی خواتین جو شاہ ایران کے خلاف مظاہروں میں شرکت کرتی تھیں) خوفزدہ تھے کہ کہیں انہیں خبر نہ ہو جائے اور یہ ہمارے کام میں رکاوٹ نہ بن جائیں۔'' یہ لوگ تو کیا، تمام بڑی قوتیں ان سے ڈرتی ہیں۔ یہ خواتین جن کی کوئی سربراہی کرنے والا

نہیں؛ یہ اپنے ذاتی جذبے کے ساتھ پوری ملت کو آپس میں متحد کرتی ہیں۔ سید مظلوم کی انہی مجالس عزاو سوگواری، نوحہ خوانی اور ذکر مظلومیت امام حسینؑ (کہ جنہوں نے خدااور اس کی رضا کی خاطر اپنی جان اور اولاد و اصحاب کو فدا کر دیا) نے ایسے جوان پیدا کئے جو جنگ (ایران پر صدام کی مسلط کردہ آٹھ سالہ جنگ) میں شرکت اور شہادت کی آرزو رکھتے ہیں اور شہادت پر فخر کرتے ہیں۔ اسی نے ماؤں کو صبر اور جرات میں ایسا دلیر بنا دیا کہ جب ان کا کوئی بیٹا شہید ہوتا تو کہتیں؛ ہمارے پاس جنگ میں بھیجنے کے لیے مزید ایک دو فرزند اور موجود ہیں۔''

امام خمینیؒ کے الفاظ لوگوں کے دلوں میں اس قدر موثر ہوتے کہ جب جنگ کے دس بارہ سال بعد بھی بعض شہداء کی صرف چند ہڈیاں اور گلے میں نمبر والی زنجیر اُن کی عظیم ماؤں کو دی جاتی تو جناب زینب کبریٰ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہ بھی یہی کہتی نظر آتیں کہ، اے خدا۔ ہم نے تیرے مقرب بندے کی پکار پر لبیک کہا ہے۔ یہ معاملہ ہم نے تیرے ساتھ کیا ہے اور جو ہم نے تیری راہ میں دے دیا، اس کی واپسی کی بھی ہمیں کوئی تمنا نہیں۔ یہاں پر میں ایران کے ایک شہر اراک میں بسنے والے ایک شہید کے خاندان کا واقعہ بیان کرنا چاہوں گا۔ اس گھر میں ماں نے تین بیٹے، ایک بھائی اور چند بھانجے جنگ کے دوران اسلام کے لیے قربان کیے ہیں اور دو بیٹے جنگ میں معذور ہو گئے ہیں۔

ایرانی سال کے آغاز سے ایک روز پہلے، جسے نوروز کہتے ہیں، شہر اراک میں سیکڑوں شہید لائے گئے جن میں اس گھر کے دو شہید بھی شامل تھے۔ تمام شہداء سے وداع کے لیے ایک محفل کا انتظام کیا گیا جہاں پر شہداء کے جنازوں کے علاوہ ان کے ورثاء بھی موجود تھے۔ ان دو شہیدوں کی ماں، دوسرے شہیدوں کے ورثاء کی مانند، نہایت قوی روح اور مضبوط ارادے کے ساتھ کھڑی ہو کر ہزاروں آنے والوں کی تعزیت قبول کرتی رہیں اور غافلوں کو استقامت کا ایک بے مثال درس دیتی رہیں۔ البتہ کبھی کبھار آنے والوں سے یہ کہتیں کہ میرے یہ بیٹے علی اکبر اور قاسم سے زیادہ عزیز تو نہ تھے۔ یہاں تک کہ امام خمینیؒ کی وفات ہو گئی۔ اس وقت جب لوگ انہیں ملنے گئے تو انہوں نے کہا کہ امام خمینیؒ کی وفات نا قابل برداشت ہے، اور ساتھ ہی ان کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ وہ کہتیں، ''میرا دل چاہتا ہے کہ جتنا جلدی ہو سکے، میں امام خمینی کے گھر والوں سے جا کر ملاقات کروں اور انہیں بتاؤں کہ ہم ان کے ساتھ ہیں، جیسے امام خمینیؒ ہمیشہ ہمارے ساتھ تھے۔''

ایران کے لوگوں پر امام خمینیؒ کا اتنا گہرا اثر صرف عاشورا میں قیام حسینی اور صبر زینبی کا واضح نمونہ ہے۔ امام خمینیؒ نے بھی کس قدر فصیح و بلیغ انداز میں کربلا کی تفسیر کی اور لوگوں نے بھی کس قدر خوبصورتی سے آپ کے فرمان پر جان نچھاور کی۔ایک اور مقام پر امام خمینیؒ جمعہ اور جماعات کے پیش نماز حضرات سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں '' جس قدر میں آگاہ ہوں، اس سے بڑھ کر صحیح طریقے سے مسئلہ عاشورا کو لوگوں کے لیے واضح کریں۔ کہیں لوگ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کے ہم رونے والی قوم ہیں۔ ہم وہ ملت ہیں جس نے دو ہزار پانچ سو سالہ جابر حکومت کا تختہ اُلٹ دیا۔''

ان تمام چیزوں کے بیان کا مقصد یہ ہے کہ عاشورا کا اصل مقصد سمجھ میں آجائے اور وہ مقصد ہر ظلم کے مقابلے میں آواز اٹھانا، ہر برائی کا خاتمہ، مظلوم کی فریادرسی اور ظلم و ظالم کا قلع قمع ہے۔ چاہے اس راہ میں جان، مال، عزت، آبرو اور حتی ناموس ہی کیوں نہ فدا کرنی پڑ جائے۔ اسی طرح ایک اور درس خواتین کا کردار ہے کہ جس کی بہترین مثال ہمیں کربلا میں ملتی ہے۔آج اس کی مثال ایران کے انقلاب اور لبنان کے مُٹھی بھر شیعوں میں دکھائی دیتی ہے جنہوں نے مکتب عاشورا سے صحیح درس حاصل کرکے قابل فخر پرچم حسینی کو ایک مرتبہ پھر لہرا کر دکھایا اور سوتی ہوئی انسانیت کو ماننے پر مجبور کر دیا کہ جیت صرف حق والوں کی ہوتی ہے، چاہے وہ تعداد میں کم ہی کیوں نہ ہوں۔

ایک اور چیز جو ان مثالوں میں بہت خوبصورتی سے دکھائی دیتی ہے، وہ ولی کی اطاعت ہے۔ جیسا کہ کربلا میں سب کچھ امام کی اجازت سے انجام پایا۔ اسی لیے کوئی بھی بغیر اذن امام (ع) کے، مقتل میں جنگ کو نہ گیا۔ اسی طرح امام خمینی کے زمانے میں بھی ایرانی ملت نے ان کی اطاعت کی۔ لبنان میں بھی یہی دیکھنے کو ملتا ہے کہ وہ چیز جو فتح کا باعث بنی، وہ اطاعت رہبر اور وحدت تھی۔ سید حسن نصراللہ، حزب اللہ کے جنرل سیکرٹری نے اسرائیل کی ذلت آمیز شکست کے بعد ایک انٹرویو میں کہا کہ ہمیں یہ فتح رہبر مسلمین جہاں حضرت آیت اللہ سید علی خامنہ ای کی اطاعت و فرمانبرداری سے حاصل ہوئی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، جناب زینب کبریٰ علیہا السلام نے سب سے پہلی عزاداری گیارہویں محرم کے دن کربلا میں برپا کی اور آپ شجاعت و استقامت کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں بھی انجام دیتی رہیں نیز بیمار کربلا سید السّاجدینؑ کی تیمارداری کے فرائض بھی انجام دیتی رہیں۔ ایک موقع پر جب آپ نے دیکھا کہ امام زین العابدینؑ بالکل نڈھال ہوگئے ہیں اور آپ کی روح پرواز کرنے کو ہے تو آپ نے فوراً اپنے مقتول

بھائی کے بدن مبارک کو چھوڑا، ایک خاص تدبیر کے ساتھ امام زین العابدینؑ کو تسلّی دی اور ان دشوار گھڑیوں میں بھی یہ حدیث بیان کی کہ '' یہ شہادت بامقصد تھی۔ ایسا ہرگز نہ سمجھ لینا کہ بس حسین (ع) شہید ہوگئے اور ختم ہوگئے۔ میں نے اپنے جد امجد ﷺ سے یہ حدیث سنی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ حسین (ع) اسی جگہ پر، (جہاں تم ان کا جسد مبارک دیکھ رہے ہو) بغیر کفن کے دفن کیۓ جائیں گے اور یہیں پر ان کی قبر لوگوں کی زیارت گاہ بنے گی۔''

در حقیقت مستقبل کی خبر دے کر جناب زینب کبریٰ نے امام زین العابدینؑ کو حوصلہ بھی دیااور یہ بھی بتا دیا کہ ہم اپنے کردار سے ایک نئی تاریخ رقم کر رہے ہیں جس میں فتح ہماری ہوگی اور یہی مظلوم امام، جو ابھی بے غسل و کفن کھلے آسمان تلے، اپنے مخلص اصحاب کے ساتھ مقتول پڑے ہیں، ایک دن صاحب گنبد و بارگاہ ہونگے اور زائرین دور و نزدیک سے زیارت کرنے کے لیے یہاں حاضر ہوں گے۔

اسی طرح جب بارہ محرم کو قافلہ دروازہء کوفہ پر پہنچا تو اس قدر شور و غوغا تھا کہ الامان۔ اکثر لوگ اہل بیت (ع) کی معرفت نہ رکھنے کی وجہ سے تالیاں بجا رہے تھے اور خوشی کا اس طرح اظہار کر رہے تھے کہ اگر اس وقت ڈھول بھی بجایا جاتا تو اس کی آواز بھی کسی کو سنائی نہ دیتی۔ لیکن ایسے وقت میں جناب سیدہ زینب (ع)، جو نویں محرم کی رات سے مسلسل بیدار تھیں اور ایک لمحے کے لیے بھی نہ سو سکی تھیں، اس قدر وقار اور شجاعت و دلیری کے ساتھ شہر میں داخل ہوئیں کہ آپ کے ایک اشارے پر لوگوں کی سانسیں سینوں میں محبوس ہو گئیں، بچوں کے رونے کی آواز اور یہاں تک کہ تاریخ نے لکھا ہے کہ جانوروں کی گردن میں بندھی گھنٹیوں کی آواز بھی بند ہو گئی۔ مجمع پر ایک سکتہ طاری ہو گیا۔ اور پھر جناب ثانی زہرا (ع) نے خطاب فرمایا۔

کربلا بہت ہی عظیم سانحہ تھا، لیکن جو خدا کو عظیم جانتا ہے، اس کے لیے ہر شیئ معمولی ہو کر رہ جاتی ہے۔ پھر جب حکومت بنی امیہ کے نمائندے نے پوچھا کہ تم نے اس سب کو کیسا دیکھا؟ تو جناب زینب کبریٰ (ع) نے فرمایا؛ '' ما رایتُ الاّ جمیلاً'' مجھے خوبصورتی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا''۔ عارف کی نگاہ میں خدا کا ہر کام حکمت پر مبنی ہے۔ اس کے ہر ارادے میں انسان کی تربیت دکھائی دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ عارفان حق ہمیشہ اس کے سب امور میں خوبصورتی دیکھتے ہیں کیونکہ اس میں رب کی رضا ہوتی ہے۔ راوی کہتا ہے کہ جب جناب زینب کبریٰ خطبہ دیتیں تو آپکے کلام میں حیدری شجاعت اور فاطمی عصمت

واضح دکھائی دیتی۔ یوں لگتا کہ علیؑ کے لہجے میں فاطمہؑ خطاب فرما رہی ہیں۔ یہ اسی تربیت کا اثر تھا جو آپکو جناب رسول ﷺ کے گھرانے سے نصیب ہوئی۔ یہ اس ماں کی گود کا اثر تھا جس نے کسی کے کہے بغیر سب کچھ خود کر دکھایا۔ یہ اس باپ کی حلال روزی کا اثر ہے، جس نے زندگی کے مقیاس کو ہمیشہ صداقت، عدالت اور شجاعت کے ترازو میں رکھا؛اسی لیے نہ کسی پر ظلم کیا اور نہ غیر خدا سے کوئی توقع رکھی۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو پیام زینب میں آج بھی سنائی دے رہی ہیں اور تا قیامت سنائی دیتی رہیں گی۔ آج بھی اگر معاشرے میں عورت کا وقار بحال ہو جائے تو گذشتہ بہاریں پھر سے لوٹ آئیں گی۔ جب جناب زینب کبریٰ(س) کا نہایت مختصر خطبہ تمام ہوا تو سب کے سب انگشت بدندان حیران وپریشان کھڑے دیکھتے رہے۔ ان کی فتح کی خوشیاں، غم میں تبدیل ہو گئیں۔

یہی وجہ ہے کہ تاریخ نے کربلا میں کوفیوں کی سرکشی کی ایک وجہ ان کی خواتین کا اجتماعی امور سے مطلع نہ رہنا، حالات سے بے خبری اور مسلمانوں کے امور میں دلچسپی نہ لینا بیان کیا ہے۔ اکثریت کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کوفہ کا گورنر کون ہے؟یزید کون ہے؟ کس قسم کا انسان ہے؟ان خواتین کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ جناب مسلم بن عقیل کتنے دنوں سے کوفہ میں مقیم ہیں اور ان کے مردوں سے بیعت لے رہے ہیں۔ ان کی عورتوں کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ حسینؑ اس وقت کہاں ہیں اور کن کی دعوت پر اپنی آل واولاد اور اصحاب کے ساتھ حج بیت اللہ الحرام کو عمرہ مفردہ میں بدل کر کوفیوں کے مہمان بننے آرہے ہیں۔ البتہ بعض واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کچھ خواتین کو مختصر واقعات کی اطلاع تھی، لیکن یا تو اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی یا وہ بھی دشمن کی سازشوں اور فریب کارانہ ہتھکنڈوں میں پھنس گئی تھیں۔

کربلا ایک ایسا منظر ہے جس میں ہر قسم کی قربانی نظر آتی ہے۔ گویا خدا نے مقدر فرما دیا ہے کہ اس واقعے میں مرد کا بھی کردار ہو، عورت کا بھی کردار ہو، پیر و جوان کا بھی کردار ہو، سیاہ فام و سفید فام کا بھی کردار اور عرب و عجم کا بھی کردار ہو۔ یہ جو مشہور ہے کہ کربلا میں بنیادی کردار ایک خاتون کا تھا، اس کا مطلب ہے کہ تمام خواتین کا کردار تھا لیکن سب سے زیادہ کلیدی کردار اور سپہ سالاری کے فرائض جناب زینب کبریٰ کے تھے جن کی قربانی سب سے بڑی تھی۔ اسی طرح عبد اللہ بن عمیر کلبی کی زوجہ بھی کربلا میں شہید ہوئیں۔ کربلا میں تین افراد اپنے گھر والوں کے ساتھ میدان کارزار میں تشریف لائے؛ مسلم بن عوسجہ، عبداللہ بن عمیر کلبی اور تیسرے جنادۃ بن حرث الانصاری۔

جناب عبداللہ بن عمیر کے بارے میں صاحبان تاریخ لکھتے ہیں کہ آپ کوفہ سے باہر تھے کہ آپ کو اطلاع ملی کہ کوفہ میں کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔ اپ مجاہدین اسلام میں سے تھے۔ آپ نے فیصلہ کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی آل کی حفاظت کریں گے۔ آپ فوراً گھر پہنچے۔ زوجہ سے مشورہ کیا، آپکی زوجہ نے آپکو تحسین و آفرین کہی لیکن یہ بھی کہا کہ اس کی ایک شرط ہے، اور وہ یہ کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر چلو۔ آپ اپنی زوجہ کو لے کر چلنے لگے تو آپ کی والدہ بھی ساتھ چل پڑیں۔ بہرحال عبداللہ بن عمیر میدان کارزار میں وارد ہوئے۔ بہت سے سرکشوں کو واصل جہنم کیا لیکن کسی نے پشت سے حملہ کیا اور آپ کا ایک ہاتھ تن سے جدا کر دیا۔ آپ نے دوسرے ہاتھ سے وار کر کے اسے ختم کر دیا اور اسی حال میں رجز پڑھتے ہوئے سردار شہیداں کے پاس پہنچے۔ پھر اپنی ماں سے عرض کیا، ''کیا میں نے خوب عمل کیا ہے، کیا تم مجھ سے راضی ہو گئیں؟'' ماں نے جواب دیا؛ ''نہیں۔ میں تم سے راضی نہیں ہوں گی جب تک تمہیں شہید ہوتا نہ دیکھ لوں۔'' اس اثناء میں ان کی بیوی جو نوجوان تھی، آکر ان کے دامن سے لپٹ گئی۔ ماں نے فوراً کہا؛ ''میرے بیٹے۔ کہیں جذبات تم پر غالب نہ آجائیں۔ یہ وقت اپنی بیوی کی باتیں سننے کا نہیں ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں تم سے راضی ہو جاؤں تو تمہیں شہید ہی ہونا پڑے گا۔'' تب عبداللہ بن عمیر ایک بار پھر میدان میں گئے اور اس بار شہید ہو گئے۔ دشمن نے ان کا سر کاٹ کر ان کے خیمے کے دروازے پر پھینک دیا۔ ماں نے جھک کر اسے اٹھایا، پیار کیا، چوما اور کہنے لگی ''ہاں بیٹا۔ اب میں تجھ سے راضی ہو گئی''۔ پھر اس نے کٹے سر کو دشمن کی طرف واپس پھینکتے ہوئے کہا ''ہم جو چیز خدا کی راہ میں دے دیتے ہیں، اسے واپس نہیں لیتے''۔ اور پھر وہ خیمہ کا ایک ستون لے کر دشمن پر حملہ آور ہو گئیں۔

اسی طرح دلیر ماں کا ایک اور واقعہ نقل ہے کے کربلا میں ایک جوان جس کا والد شہید ہو گیا تھا امام حسینؑ سے اذن جہاد لینے آیا۔ امام نے فرمایا اس کو جانے نہ دیں، اس کا بابا شہید ہو چکا ہے بس یہی کافی ہے؛ اس کی ماں بھی یہیں پر حاضر ہے کیا معلوم وہ راضی نہ ہو۔ جوان فوراً بولا ''یا ابا عبداللہ الحسینؑ، میری ماں نے ہی یہ شمشیر میری کمر میں باندھی ہے اور مجھے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ جاؤ تم بھی اپنے بابا کے راستے پے چلتے ہوئے اپنی جان امام حسینؑ پر قربان کر دو۔''

جانفشانی اور قربانی کی یہ مثالیں انسانیت و بشریت کے لیے مکتب حسینی اور زینبی کا تحفہ ہیں۔ آج دنیا میں جہاں کہیں بھی ایثار و قربانی کا ذکر ہوتا ہے وہاں خواہ نخواہ حسین و زینب کا تذکرہ ضرور ہوتا ہے۔ اگر کربلا

نہ ہوتا تو انسانیت ہرگز فلسفہ حیات جاوداں سے باخبر نہ ہوتی۔ کربلا نے انسانیت کو صرف جینے کا ڈھنگ نہیں بلکہ مرنے کا سلیقہ بھی سکھا دیا۔ یہ انہی مائوں کا کردار ہے کہ جو مقصد حیات کو سمجھ گئیں اور با معرفت آغوش میں ایسی اولاد کی تربیت کی کے جسے اگر ابراہیم قربانگاہ میں چلنے کو کہیں تو بجای علت و سبب پوچھنے کے اسماعیل کی طرح باپ کو اس کے امتحان میں مدد کرتے ہیں اور جیسا خدا نے اپنے کلام میں فرمایا کہ جب ابراہیم نے اسماعیل سے کہا کہ مجھے تیری قربانی کا حکم ملا ہے تو اس کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ تو جواب میں اسماعیل نے فرمایا: يَٰٓأَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيٓ إِنْ شَاءَ اللهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ باباجو آپ کو حکم ہوا ہے انجام دیجئے، انشاللہ آپ مجھ صابرین میں سے پائیں گے۔

امام خمینی فرماتے ہیں؛ ''امام حسینؑ نے اپنی ذمہ داری سمجھی تاکہ اس قوت کے مقابلہ میں قیام کریں اور شہید ہو جائیں۔ تاکہ اپنی اور اصحاب کی قربانی سے حالات کو دگرگوں کریں۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک جابر نے ان کی حکومت پر قبضہ کرلیا ہے، انہوں نے خدا کی جانب سے اپنی ذمہ داری سمجھی کہ اس کا مقابلہ کریں، ان کی مخالفت کریں، ان کا انکار کریں اور پھر جو ہوتا ہے ہو جائے۔ اور بخوبی واضح تھا کہ اتنی کم تعداد ان کا مقابلہ نہیں کر پائے گی لیکن ان کی شرعی ذمہ داری تھی۔ لیکن سید الشہدا کے لیے یہ شرعی ذمہ داری تھی کے قیام کریں، خون دیں اور اس حکومت کا تختہ الٹ دیں، یزیدی پرچم کو سرنگوں کرڈالیں۔ اور ایسا ہی ہوا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے اپنا خون، بچوں کا خون اور اولاد کا خون اور اپنا سب کچھ اسلام کی حفاظت اور بقاء کے لیے دے دیا۔''

کس قدر خوب درس دیا ہے سید الشّہداء امام حسینؑ نے اور کس قدر خوب امام خمینی نے درس حاصل لیا ہے۔ اور صد آفرین ان مائوں پر جنہوں نے اپنے پیشواؤں اور راہنماؤں کی ہدایت پر عمل کرکے ایک زندہ و بیدار قوم کی تربیت کی اور ایسے فرزند پروان چڑھا ہے جنہیں دیکھ کر تاریخ کی مائیں رشک کرتی ہیں۔ ہمیشہ تقویٰ کی گود میں پلنے والے مجاہدوں ہی نے اسلام اور انقلاب کی نصرت و حفاظت کی ہے۔ یہ اثر ہے کربلای معلّیٰ میں موجود خواتین کا جنہوں نے اپنے کردار کے ساتھ سید الشّہداء علیہ السلام اور جناب زینب کبریٰ علیھا سلام کا ساتھ دے کر تاریخ کے ایسے اوراق رقم کیے جن کی مثال نہ ملی ہے نہ مل سکے گی۔

☆☆☆☆

# کربلا کی شعری روایت

# The Poetic Tradition of Karbala

سید نثار علی ترمذی

واقعۂ کربلا اورامام عالی مقام کی لازوال قربانی کے اردوزبان پر گہرے اثرات مرتب ہوئے اسے کئی حوالوں سے دیکھا جاسکتا ہے ایک توو ثائی ادب ہے جس میں مرثیہ، نوحہ، سلام، سوز اور دوہہ وغیرہ شامل ہیں جو خالصتاً کربلا اورامام حسین اوران کے جانثاراں کے عظیم کارنامے کو نہ صرف بیان کیا گیا بلکہ اپنی عقیدت کااظہار بھی کیاگیا یہ ایک اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ جس کی اہمیت اور معنویت مسلم ہے اس کے علاوہ بھی اردو، غزل اور نظم میں جابجا کربلا، قربانی، علم، پیاس، خون وغیرہ ذکر کرکے شاعر نے اپنے مخاطبین پیغام دیا ہے اس کے علاوہ بھی بہت سے اشعار ایسے ہیں کہ جن میں کربلاکے حوالے سے براہ راست کوئی علامت بیان نہیں ہوئی مگر شعر کا مفہوم بتادیتا ہے کہ اس کا پس منظر کربلا سے حاصل کیاگیا ہے مثلاً:

قتل گاہوں سے چن کے ہمارے علم اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

گو اس شعر میں بظاہر کربلا کی مناسبت سے کوئی تذکرہ نہیں ہے مگر پڑھنے والا کربلاکے پس منظر تک پہنچ جاتا ہے۔ زیر نظر مضمون میں رثائی ادب کے بجائے اردو ادب کا ایک مختصر سا جائزہ پیش کیا گیا ہے کہ جہاں کربلا کی نسبتیں اشعار میں جلوہ گر ہوئی ہیں۔

## میر تقی میر

اردو میر تقی میر سے پہلے بولی اور لکھی جارہی ہے میر کے دور سے ہی عموماً اردو کا حوالہ بیان کیا جاتا ہے۔ مثلاً میر کے یہ اشعار اگرچہ کسی سلام یامرثیہ کا حصہ نہیں ہیں مگر کربلا کی مناسبت دیکھیے:

شیخ پڑے محراب حرم میں پہروں دوگانہ پڑھتے رہو
سجدہ ایک اس تیغ تلے کا ان سے ہو تو سلام کریں

یا یہ شعر:

زیر شمشیر ستم میر تڑپنا کیسا سر بھی تسلیم محبت میں ہلایا نہ گیا

یا یہ شعر:

وا اس سے سر حرف تو ہو گو کہ یہ سر جائے　　　ہم حلق بریدہ ہی سے تقریر کریں گے

بظاہر یہ اشعار کسی عشقیہ غزل سے لئے گئے ہیں مگر ان میں اسی تاریخی روایت کا حوالہ ہے کہ جہاں سے ایمانی رشتوں کی روشنی ملتی ہے۔

**مرزا غالب**

مرزا غالب کو اردو شاعری میں جو مقام حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے مگر اس کے شعری مجموعہ میں اس حوالے کوئی تذکرہ نہیں ملتا '' یادگار غالب '' میں یہ تذکرہ ملتا ہے کہ جب انھوں نے کسی کے کہنے پر مرثیہ لکھنا شروع کیا تو چند بند لکھ کر چھوڑ دیا اور کہا '' یہ ان لوگوں کا حصہ ہے جنھوں نے اس وادی میں عمریں بسر کی ہیں۔ '' مگر غالب فارسی غزل میں حمد کے انداز میں کہہ چکے ہیں:

بزم ترا شمع و گل خستگی بوتراب　　　ساز ترا زیر و بم واقعہ کربلا

**مولانا محمد علی جوہر**

جب بر صغیر میں آزادی کی تحریک چلی تو کربل کی روایت اردو شاعری پھولی پھلی مولانا محمد علی جوہر تحریک خلافت کے روح رواں تھے انہوں نے اپنی جدوجہد اور شاعری سے ہندوستان کے مسلمانوں کو زبان دی ان کے اشعار میں جابجا کربلا کی مناسبت سے تذکرہ ملتا ہے ان کے یہ مشہور شعر جو آج بھی زبان زد عام ہے ملاحظہ کیجئے:

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے　　　اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اس کے علاوہ بھی مولانا کے اشعار ہیں کہ جن میں انہوں نے ظلم و جور، جبر استبداد کے خلاف کربلا کو ہی اپنا نمونۂ عمل بنایا ہے:

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو　　　خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لئے ہے

فرصت کسے خوشامد شمر و یزید سے　　　اب ادعائے پیروی پنجتن کہاں

کہتے ہیں لوگ ہے رہ ظلمات پُر خطر　　　کچھ دشت کربلا سے سوا ہو تو جانیے

جب تک کہ دل سے محو نہ کربلا کی یاد　　　ہم سے نہ ہو سکے گی اطاعت یزید کی

بنیاد جبر و قہر اشارے میں ہل گئی　　　ہو جائے کاش پھر وہی ایمائے کربلا

روز ازل سے ہے یہی اک مقصد حیات		جائے گا سر کے ساتھ ہی سودائے کربلا

## علامہ محمد اقبال

شہادت امام حسین کے نئے پہلوؤں پر سب سے پہلے علامہ اقبال نے اظہار خیال کیا ہے۔ اقبال نے اردو فارسی میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ علامہ اقبال امام حسین سے روشنی لے کر ملت کی شیرازہ بندی کرنا چاہتے تھے:

غریب وسادہ ورنگین ہے داستان حرم		نہایت اس کی حسین، ابتدا ہے اسماعیل
صدق خلیل بھی ہے عشق، صبر حسین بھی ہے عشق		معرکہ وجود میں بدر وحنین بھی ہے عشق

علامہ اقبال کربلا اور امام حسین کو قربانی اسماعیل کا تسلسل جانتے ہیں بلکہ ''ذبح عظیم'' کا مصداق قرار دیتے ہیں جس کا اظہار انہوں نے اپنے فارسی کلام میں بھی کیا ہے:

اللہ اللہ بائے بسمہ اللہ پدر		معنی ذبح عظیم آمد پسر

یعنی کہ حضرت اسماعیل کی قربانی کو جس عظیم قربانی سے بدل دیا گیا تھا وہ امام حسین کی قربانی ہے اور یہ نکتہ کوئی آگاہ شخص ہی بیان کرسکتا ہے اور یہ قربانی مفہوم کی دلربا تفسیر بھی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ قربانی حسین کا اسلام میں کیا مقام ہے اور منشاء ایزدی میں قربانی حسین کب سے جلوہ گر تھی۔

اقبال کی شاعری میں یہ اشعار بھی ملتے ہیں:

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری		بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی وشامی
قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں		گرچہ ہے دابدار ابھی گیسوئے دجلہ وفرات

''بال جبرائیل'' میں علامہ ''فقر'' کے عنوان سے ایک مختصر نظم میں جس میں فقر کی اقسام بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری		اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی ودلگیری		اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری
اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری		میراث مسلمانی، سرمایہ شبیری

علامہ اقبال برصغیر کے مسلمانوں خصوصاً علماء کرام اور حجروں میں بند بزرگان دین کو دعوت فکر دیتے ہیں:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری		کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ دلگیری (ارمغان حجاز)

جس وقت علامہ نے یہ بات کی تو پوری امت محمدی ﷺ غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی مگر علامہ انہیں انہیں رسم شبیری ادا کرنے کا کہہ رہے ہیں اقبال کی فکر کتابوں میں رہ جاتی مگر ایران میں ایک مرد جلیل نے رسم شبیری ادا کرکے اس فکر کو دنیا میں جیتا جاگتا مجسم کر دیا ہے آج جہاں بھی مسلمان مجبور ہیں وہ رسم شبیری ادا کر رہے ہیں یا اسی فکر کو اپنانے کی فکر میں ہیں لیکن اقبال یہ فکر دینے میں فوقیت حاصل کر گئے۔ علامہ اقبال کا کچھ کلام باقیات اقبال کے نام سے شائع ہوا ہے جسے علامہ اقبال نے اپنے کلام کو مرتب کرتے وقت نظر انداز کر دیا تھا اس میں سے دو شعر پیش ہیں:

جس طرح مجھ کو شہید کربلا سے پیار ہے　　　　حق تعالیٰ کو یتیموں کی دعا سے پیار ہے
رونے والا ہوں شہید کربلا کے غم میں　　　　کیا دُر مقصود نہ دیں گے ساقی کوثر مجھے

علامہ اقبال نے اپنے کلام کو وسعت اور زندہ وجاوید رکھنے کے لئے جہاں آفاقی نظریات پیش کئے وہاں فارسی زبان میں بھی اظہار خیال فرمایا علامہ کے فارسی کلام کو پڑھے بغیر ان کے نظریات بالخصوص ''نظر خودی'' سے مکمل آگاہی حاصل نہیں ہو سکتی۔ علامہ اقبال نے رموز بے خودی میں ''در معنی حریت اسلامیہ وسیر حادثہ کربلا'' کے عنوان سے امام عالی مقام کو خراج عقیدت پیش کیا ہے اس علامہ اقبال اسلام کی خصوصات بیان کرتے ہوئے کربلا کا تذکرہ کرتے ہیں شروع کے کچھ اشعار عقل وعشق کے ضمن میں ہیں اس کے بعد اقبال جب اصل موضوع پر آئے ہیں تو صاف اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کردار حسین کو کس نئی روشنی میں دیکھ رہے ہیں اور کن پہلوؤں پر زور دینا چاہتے ہیں حسین کے کردار میں انہیں انہیں عشق کا وہ تصور نظر آتا ہے جو ان کی شاعری مرکزی نقطہ ہے اور اس میں انہیں انہیں حریت کا وہ شعلہ بھی ملتا ہے جس کی تب وتاب سے وہ ملت کی شیرازہ بندی کرنا چاہتے تھے آیئے ان فارسی اشعار کا مطالعہ کرتے ہیں:

ہر کہ پیماں باھُوَ المَوجود بست　　　　گردنش از بند ہر معبود رست

''جو شخص قوانین خداوندی کی اتباع کو مقصود زندگی قرار دے لے اور اسی طرح اپنا عہد وپیان اللہ سے باندھ لے اس کی گردن میں کسی آقا کی غلامی اور محکومی کی زنجیر نہیں رہتی۔''

پہلے شعر کے بعد علامہ نے عشق وعقل کا خوبصورت موازنہ پیش کیا ہے یہ موازنہ پیش کرکے اقبال بتانا چاہتے ہیں کہ امام حسین اور کربلا کو سمجھنے کے لئے عقل کافی نہیں بلکہ عشق کی نظر چاہئے امام عالی مقام

کا یہ کارنامہ عقل کی بنا پر ظہور پذیر نہیں ہوا بلکہ عشق کی قوت کارفرما تھی اس لئے ایسے لوگ جو عقلی دلائل پر واقعہ کربلا کی توضیح کرتے ہیں وہ ہمیشہ شک وتردید کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جو عشق کی نظر سے دیکھتے ہیں تو پھر وہ اس نتیجہ پر جا پہنچتے ہیں جہاں علامہ اقبال پہنچ گئے ہیں:

عشق را آرام جاں حریت است　　　　ناقہ اش را ساربان حریت است

''عشق کو کامل سکون اور اطمینان آزادی ملتا ہے اس کے ناقہ کی ساربان حریت ہے۔''

آن شنید ستی کہ ہنگام نبرد　　　　عشق با عقل ہوس پرور چہ کرد

اقبال تمہیدی اشعار کے بعد واقعہ کربلا کی طرف آتے ہیں اور کہتے ہیں ''تم نے سنا ہے کہ کربلا کے میدان میں عشق نے عقل کے ساتھ کیا کیا۔''

آں امام عاشقان پور بتول　　　　سرد آزادے زبستان رسول ﷺ

اللہ اللہ بائے بسمہ اللہ پدر　　　　معنی ذبح عظیم آمد پسر

عاشقوں کے امام حضرت فاطمہؑ کی اولاد اور حضور ﷺ کے گلستان کے پھول ہیں حضرت علیؑ ان کے والد بزرگوار ہیں اس میں ''اللہ اللہ'' وہ کلمہ تحسین ہے جو مرحبا اور شاباش کے معنوں میں آتا ہے اس کے بعد حضرت علیؑ کو ''بائے بسمہ اللہ'' سے یاد کیا گیا ہے یہ خود علامہ اقبال کی اہل بیت شناسی پر ایک دلیل ہے امام حسینؑ کو ''ذبح عظیم'' کا مصداق قرار دیا ہے علامہ اقبال قربانی امام حسینؑ کو قربانی اسماعیل کا تسلسل قرار دیتے ہیں۔

بہر آں شہزادہ خیر الملل　　　　دوش ختم المرسلین نعم الجمل

روایت میں ہے کہ ایک دن نبی اکرم ﷺ اپنے دونوں نواسوں کو کندھوں پر سوار کرکے کھیلا رہے تھے آپ ﷺ نے اس وقت فرمایا کہ تمہارا اونٹ کیسا اچھا ہے اور اس کی سواریاں کیسی خوب ہیں ''نعم الجمل'' اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

سرخ رو عشق غیور از خون او　　　　شوخی ایں مصرع از مضمون او

امام حسینؑ کے خون کی رنگینی سے عشق غیور سرخ رو ہے کربلا کے واقعہ سے اس موضوع میں حسن اور رعنائی پیدا ہو گئی ہے۔

درمیاں امت آں کیواں جناب　　　　ہمچو حرف قل ھو اللہ در کتاب

امت محمدیہ ﷺ میں آپ کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے قرآن مجید میں سورۂ اخلاص کی ہے سورۂ اخلاص میں توحید پیش کی گئ جو کہ قرآنی تعلیمات کا مرکزی نکتہ ہے اسی طرح امام حسین کو بھی امت میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

موسیٰ وفرعون وشبیر ویزید این دو قوت از حیات آید پدید
زندہ حق از قوت شبیری است باطل آخر داغ حسرت میری است

دنیا میں حق و باطل کی کشمکش شروع سے چلی آرہی ہے اس کشمکش میں مجاہدین کی قوت بازو سے حق کا غلبہ ہوتا ہے اور باطل شکست و نامرادی سے دچار

چوں خلافت رشتہ از قرآن گسیخت حریت راز ہر اندر کام ریخت
خاست آں سر جلوہ خیر الامم چوں سحاب قبلہ باراں در قدم
برزمین کربلا بارید ورفت لالہ در ویرانہ کارید رقت

جب خلافت کا تعلق قرآن سے منقطع ہوگیااور مسلمانوں کے نظام میں حریت فکر و نظر باقی نہ رہی تو اس وقت امام حسینؑ اس طرح اٹھے جیسے جانب قبلہ سے گھنگھور گھٹا اٹھتی ہے یہ بادل وہاں سے اٹھا کربلا کی زمین پر برسا اور اسے لالہ زار بنادیا۔

تا قیامت قطع استبداد کرد موج خون او چمن ایجاد کرد

آپ نے اس طرح قیامت تک ظلم واستبداد کے راستے بند کردیئے اور اپنے خون کی سیرابی سے ریگزاروں کو چمنستان بنادیا۔

بہر حق در خاک وخوں غلطیدہ است پس بنائے لاالہ گرویدہ است

آپ نے حق کے غلبہ کے لئے جان دے دی اوراس طرح توحید کی عمارت کی بنیاد بن گئے بنائے ''لاالہ ''میں تلمیح ہے خواجہ معین الدین چشتی کے اس مصرع کی طرف:''حقا کہ بنائے لاالہ ہست حسین''

مدعایش سلطنت بودے اگر خود نکردے باچنیں سامان سفر
دشمناں چو ریگ صحرا لاتعد دوستان او بہ یزداں ہم عدد

اگر آپ کا مقصد حصول سلطنت ہوتا تو اس بے سروسامانی میں نہ نکلتے بلکہ دیگر سامان واسباب سے قطع، ساتھیوں کی تعداد کے اعتبار سے دیکھئے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مخالفین کا لشکر لا تعداد تھا مگر آپ کے ساتھ صرف بہتر (72) نفوس تھے یہاں علامہ نے یزداں کے عدد ''72'' کا حوالہ دیا ہے۔

سر ابراہیم واسماعیل بود　　　　یعنی آں جمال را تفصیل بود

کربلا کے واقع میں قربانی اسماعیل کی تفصیل ہے۔

تیغ بہر عزت دین است وبس　　　　مقصد او حفظ آئین است وبس

مومن کی تلوار ہمیشہ دین کے غلبہ واقتدار کے لئے اٹھتی ہے ذاتی مفاد کے لئے نہیں اس کا مقصد آئین اور قانون کی حفاظت ہوتا ہے۔

ماسوا اللہ را مسلمان بندہ نسبت　　　　پیش فرعونی سرش افگندہ نسبت

مسلمان اللہ کے سوا کسی کا محکوم نہیں ہوتا اس کا سر کسی فرعون کے سامنے نہیں جھکتا۔

خون او تفسیر ایں اسرار کرد　　　　ملت خوابیدہ را بیدار کرد

امام حسین کے خون نے ان اسرار ورموز دین کی تفسیر کر دی اور سوئی ہوئی ملت کا جگا یا۔

تیغ لا چو از میاں بیروں کشید　　　　از رگ ارباب باطل خوں کشید

انہوں نے جب ''لا'' کو بے نیام کیا تو باطل کے خداؤں کی رگوں سے خون جاری ہو گیا۔

نقش الا اللہ بر صحرا نوشت　　　　سطر عنوان نجات ما نوشت

باطل کے خداؤں کو مٹانے کے بعد انہوں نے سرزمین کربلا پر خدا کی توحید کا نقش ثبت کر دیا وہ توحید جو ہماری نجات کا سر عنوان ہے۔

رمز قرآن از حسین آموختیم　　　　بہ آتش او شعلہ ھا اندوختیم

ہم نے قرآن کے رموز واسرار امام حسین سے سیکھے ہیں ان کی حرارت ایمانی سے ہم نے شعلہ ہائے حیات کو جمع کیا ہے۔

شوکت شام وفر بغداد رفت　　　　سطوت غرناطہ ہم از یاد رفت

تار ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز　　　　تازہ از تکبیر او ایمان ہنوز

مسلمانوں کی کئی سلطنتیں قائم ہوئیں اور مٹ گئیں بنی امیہ کی سلطنت دمشق میں بھی اور اندلس میں بھی ،بنی عباس کی حکومت ، یہ اپنے پورے عروج کے بعد ختم ہوگئیں لیکن داستان کربلا ابھی تک زندہ ہے ہمارے تار حیات میں پوشیدہ نغمے اسی مضراب سے بیدار ہوتے ہیں امام حسین نے تکبیر کی جو آواز بلند کی تھی اس سے ہمارے ایمانوں میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔

اے صبا اے پیک دور افتادگاں　　　　اشک ما بر خاک پاک او رساں

اے صبا! تو ہماری نم آلود آنکھوں کا سلام مرقد امام حسین تک پہنچادے۔

علامہ اقبال کے کلام سے مزید مثالیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں مگر صفحات کی محدودیت کی وجہ سے دیگر شعراء کا تذکرہ کرتے ہیں: جوش ملیح آبادی نے نوحے، مرثیے تصنیف کیے جس میں انہوں نے اپنے انقلابی خیالات کا اظہار اور بھی کھل کر کیا۔

عباس نامور کے لہو سے دھلا ہوا　　　　اب بھی حسینیت کا علم ہے کھلا ہوا
دنیا تری نظیر شہادت لئے ہوئے　　　　اب تک کھڑی ہے شمع ہدایت لئے ہوئے
انسان کو بیدار تو ہو لینے دو　　　　ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین

علامہ اقبال، محمد علی جوہر اور جوش نے جو شاعری کو نئے افکار دیے بعد میں آنے والے شعراء نے اس روایت کو آگے بڑھایا:

**فراق گورکھپوری:**

خون شہید کا ترے آج ہے زیب دستاں　　　　نعرہ انقلاب ہے ماتم فتگاں نہیں

**یاس یگانہ:**

ڈوب کر پار اتر گیا اسلام　　　　آپ کیا جانیں کربلا کیا ہے

**احمد ندیم قاسمی:**

یہ شہادت ہے اس انسان کی کہ اب حشر تلک　　　　آسمانوں سے صدا آئے گی انساں انساں
جب تجھ سے ہوئے مرے تشنہ دہن کے لب　　　　اے دشت کربلا تری قسمت بدل گئی
یہ راہ حق میں صرف شہادت نہ تھی ندیم　　　　اک زندگی فنا سے بقا تک نکل گئی

**علی سردار جعفری:**

دنیا کی شہادت گاہ میں ہو جو اپنے لہو سے سرخ کفن
ہے چاک جگر کی شرط یہاں یہ حلقہ دل افگاراں ہے

در دریا ہے ایک بہتا ہوا　　جس کے ساحل بدلتے رہتے ہیں
وہی تلوار اور وہی مقتل　　صرف قاتل بدلتے رہتے ہیں

**مجید امجد:**

سلام ان پہ تہہ تیغ بھی جنھوں نے کہا　　جو تیرا حکم، جو تیری رضا، جو تو چاہے

مجید امجد عہد رفتہ کا ایک منفرد شاعر ہے جب بھی چند بڑے شعراء کا نام لیا جاتا ہے تو مجید امجد کا نام ضرور لیا جاتا ہے۔ حضرت زینب عالیہ کی خدمت میں یوں نذرانہ پیش کرتے ہیں:

وہ قتل گاہ، وہ لاشے، وہ بے کسوں کے خیام　　وہ شب، وہ سینہ کونین میں غموں کے خیام
وہ رات، جب تری آنکھوں کے سامنے لرزے　　مرے ہوؤں کی صفوں میں، ڈرے ہوؤں کے خیام
یہ کون جان سکے، تیرے دل پہ کیا گذری　　لٹے جب آگ کی آندھی میں، غمزدوں کے خیام
ستم کی رات، کالی قنات کے نیچے　　بڑے ہی خیمہ دل سے تھے عشرتوں کے خیام
تری ہی برق صدا کی کڑک سے کانپ گئے　　بہ زیر چتر مطلا شہنشہوں کے خیام
جہاں پہ سایہ کناں ہے ترے شرف کی ردا　　اکھڑ چکے ہیں ترے آنگنوں کے خیام

**منیر نیازی:**

منیر نیازی ہمارے عہد کے ایک اہم اور منفرد آواز ہے جنھوں نے اپنے مجموعے ''دشمنوں کے درمیان'' کا انتساب ہی امام حسین علیہ السلام کے نام سے کیا ہے۔

خواب جمال عشق کی تعبیر ہے حسین　　شام ملال عشق کی تصویر ہے حسین

**مصطفیٰ زیدی:**

مصطفیٰ زیدی کا ایک نامکمل مرثیہ "کربلا اے کربلا" بہت مشہور ہے اس کے علاوہ ان کے اشعار میں کربلا کے حوالے سے ذکر ملتا ہے۔

نام حسینیت پہ سر کربلائے عصر　　کس کا علم ہے کس کے علمدار دیکھنا

مجھ پر چلی ہے عین بہ ہنگامۂ سجود　　　　　اک زہر میں بجھی ہوئی تلوار دیکھنا
غیر تو رمز غم کون و مکاں تک پہنچے کربلا تیرے یہ غمخوار کہاں تک پہنچے

**شہرت بخاری:**

جز حسین ابن علی مرد نہ نکلا کوئی　　　　　جمع ہوتی رہی دنیا سر مقتل کیا کیا
آل نبی پر تنگ ہے اب تک ہر کوفے کی بستی　　　　　پائے امیر شام پہ سجدہ عین عبادت ٹھہری
پھر کوئی حسین آئے گا اس دشت ستم میں　　　　　پرچم کسی زینب کی ردا ہوتی رہے گی

**افتخار عارف:**

افتخار عارف کی شاعری میں کربلا کی تمام علامات نئے روپ لئے ہوئے ہیں:

وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے　　　　　مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے
صبح سویرے رن پڑنا ہے اور گھمسان کا رن　　　　　راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے
خلق نے اک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے　　　　　نوک سناں پہ سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
پتھر پہ سر رکھ کر سونے والے دیکھے　　　　　ہاتھوں میں پتھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

**خلیل الرحمٰن عظمی (آف انڈیا):**

سپاہ شام کے نیزے پہ آفتاب کا سر　　　　　کس اہتمام سے پروردگار شب نکلا
بس اک حسین کا نہیں ملتا کہیں سراغ　　　　　یوں ہر گلی یہاں کی ہمیں کربلا لگی

**شاذ تمکنت (آف انڈیا):**

کچھ لوگ تھے جو دشت کو آباد کر گئے　　　　　اک ہم ہیں جن کے ہاتھ سے صحرا نکل گیا

**شہریار (آف انڈیا):**

حسین ابن علی کربلا کو جاتے ہیں　　　　　مگر یہ لوگ ابھی تک گھروں کے اندر ہیں

**فارغ بخاری:**

ہے فخر نسبت شبیر پر ہمیں فارغ　　　　　بغاوتوں کی روایت ہمارے گھر سے چلی

**عبیداللہ علیم:**

اس قافلے نے دیکھ لیا کربلا کا دن　　　　　اب رہ گیا ہے شام کا بازار دیکھنا

**سلیم کوثر:**

یہ فقط عظمت کردار کے ڈھب ہوتے ہیں　　　　فیصلے جنگ کے تلوار سے کب ہوتے ہیں
جھوٹ تعداد میں کتنا ہی زیادہ ہو سلیم　　　　اھل حق ہوں تو بہتر بھی غضب ہوتے ہیں

**اقبال ساجد:**

تو نے صداقتوں کا نہ سودا کیا حسین　　　　باطل کے دل میں رہ گئی حسرت خرید کی

**امیر مینائی:**

جو کربلا میں شاہ شہیداں سے پھر گئے　　　　کعبہ سے منحرف ہوئے قرآں سے پھر گئے

**اے۔جی جوش:**

کیں دفن جو یزید نے اقدار دین کی　　　　پھر زندہ کر گئی ہے کرامت حسین کی

**بہادر شاہ ظفر:**

سکینہ نے کہا رو کر کہ میرے کان دکھتے ہیں　　　　اتار اے شمر میری بالیاں آہستہ آہستہ
جو چلنا ہے تو چل ظفر اب شاہ کے روضے پر　　　　گذر جائے گی عمر رواں آہستہ آہستہ

**ڈاکٹر بیدل حیدری:**

دشت کرب و بلا کا حال نہ پوچھ　　　　دور تک گرد یاس ملتی ہے
بھوک ملتی ہے پیاس ملتی ہے　　　　لیکن اس دشت میں مسافر کو
ایک مینار نور ملتا ہے　　　　جس سے درس شعور ملتا ہے

**نثار سید:**

نہ سر پہ چادر زہرا نہ ساتھ بھائی کا　　　　تیرے نصیب میں زینب عجب سفر آئے
حسینیت سے کرو اخذ رسم حق گوئی　　　　سواد جبر میں مشکل گھڑی آئے

**قمر جلالوی:**

اصغر جگر کو تھام کے روتی ہے فوج شام　　　　تم تیر کھا کے آئے ہو یا تیر مار کے

**گلزار بخاری:**

کسی سے اب کوئی بیعت نہیں طلب کرتا　　　　کہ اہل تخت کے ذہنوں میں ڈر حسین کا ہے

**محسن نقوی:**

شبیر کے ہاتھوں پر تو اصغر تھا وہ لیکن
نکلا سر میداں علی اکبر کے برابر

محسن کو نہیں خوف نکیرین لحد میں
کو آئے گا مولا تیرے نو کر کے برابر

اس کم سنی میں یوں صف اعدا سے انتقام
اصغر تو ابتدا میں ہوا انتہا پسند

ثابت ہوئی یہ بات دیار دمشق میں
زینب خدا کے دین کو تیری ردا پسند

☆☆☆☆

## حوالہ جات

اس مضمون کے لکھنے میں درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا:

۱۔ بر صغیر کے امامیہ مصنفقین کی مطبوعہ تصانیف اور تراجم۔ جلد اول۔
۲۔ سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ از گوپی چند نارنگ۔
۳۔ اقبال در مدح محمد و آل محمد از سید احسن ترابی۔
۴۔ مجلس اقبال از غلام احمد پرویز۔
۵۔ بنائے لاالہ از غضنفر علی ندیم۔
۶۔ باقیات اقبال۔
۷۔ مثنوی رموز بے خودی۔

# قیام کربلا اور حسینی عزت

## The Coflict of Karbala and Hussainic Dignity

سید فرحت علی کاظمی

امام حسینؑ کی شخصیت کسی بھی فرد اور قوم سے پوشیدہ نہیں ہے آپ کی تحریک عاشورا اور مقصد کسی ایک فرقہ اور گروہ کے لئے نہ تھا بلکہ جس طرح رسول خداﷺ کی رحمت واسعہ اور آپﷺ ''رحمۃ للعالمین'' ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ (وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ) ہم نے آپﷺ کو عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے اسی طرح امام حسینؑ کا ہدف اور مقصد کسی ایک فرد کے لئے نہیں بلکہ تمام عالمین کے لئے تھا جیسا کہ آپﷺ سے جب مدینہ سے کربلا کی طرف جانے کا مقصد پوچھا گیا توآپ نے فرمایا: "انی لم اخرج اشراً ولا بطراً ولا مفسداً ولا ظالما و انما خرجتُ لطلب الاصلاح فی امة جدی رسول الله ارید ان امر بالمعروف و انهیٰ عن المنکر واسیر بسیرة جدی وابی علی ابن ابی طالب" یعنی: "میں کسی شر،فساد،خوش گذرانی اور ظلم کے لئے مدینہ سے نہیں جارہاہوں بلکہ میں اپنے جد کی امت کی اصلاح کے لئے جارہا ہوں میں چاہتا ہوں کہ امر بالمعروف کروں اور نہی از منکر کروں اور اپنے جد اور والد علی ابن ابی طالب کی سیرت پر عمل کروں۔"(1)

امام کا یہ امر بالمعروف اور نھی عن المنکر کرنا تمام عالم اسلام کے لئے تھا تاکہ ہر فرد اس سے فائدہ اٹھائے اور اپنے آپ کو ذلت اور رسوائی کی لعنت سے نجات دے اور اسلام کے لئے ایسا وقت تھا کہ جس میں سنت الٰہی ختم ہورہا تھا اور بدعتوں کی ایجاد ہورہی تھی اس لئے اس وقت ایک الٰہی نمائندہ کی ذمہ داری یہی ہوتی ہے کہ اگر اس نمائندہ خدا کو جان کا نذرانہ ہی کیوں نہ پیش کرنا پڑے اس بڑی قربانی سے بھی وہ ہستی دریغ نہ کرے امام نے جو خط بصرہ کے بزرگوں کو لکھا اس میں آپ نے فرمایا کہ ''میں تمہیں کتاب خدا اور سنت رسول خداﷺ کی طرف دعوت دیتا ہوں کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ سنت مردہ ہوچکی ہے اور بدعتیں زندہ ہوچکی ہیں۔''(2)

ایسے وقت میں کہ جب بدعتوں کوزندہ کیاجارہاہو خداوندمتعال کاحقیقی نمائندہ ہی وہ عمل انجام دے سکتا ہے کہ جس کی وجہ سے بدعتیں مردہ ہوجائیں اوراسلام اورسنت الٰہی زندہ وجاوید ہوسکے اورامام نے اس کام کوانجام دینے کے لئے مدینہ سے کربلاتک کاسفرکیا اور بالآخر خداکے راستے میں قربانیاں پیش کیں اوراپنے مقصداورہدف کو تمام عالم اسلام تک پہنچایا۔

یہ وہ مقاصد اوراہداف تھے جوامام نے اپنے فرامین میں بیان فرمائے ہیں اورایک اہم ترین نقطہ اورہدف جوامام نے اپنے فرامین میں بیان فرمایا ہے وہ ہے عزت حسینی جیساکہ امام فرماتے ہیں: ''هیهات مناالذلة''،''ذلت مجھ حسین سے دور ہوئی۔''

ذلت سے دور ہونا یعنی عزت کوچاہنا، ذلت انسان کے لئے نقص ہے اورعزت انسان کے لئے کمال امام حسین اپنے لئے بھی اس کمال کے خواہاں ہیں اور تمام عالم اسلام کے لئے بھی اس کمال کوچاہتے تھے اورچاہتے تھے کہ انسان عزت اورکمال کی طرف جائے اورہروہ عمل جوانسان کوذلت یانقص کی طرف لے جائے اس سے وہ دور ہے اوریہی ھادیان برحق کاہدف ہوا کرتا ہے کہ (اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا) (3) یعنی: "ہم نے راستے کی ہدایت کردی چاہے تووہ شکرکرے اورچاہے تووہ انکار کرلے۔"

عزت اورذلت دوایسے مفاہیم ہیں کہ دونوں ایک جگہ پرجمع نہیں ہوسکتے یعنی ایک انسان میں یاعزت آسکتی ہے یاذلت دونوں ایک جسم وبدن میں جمع نہیں ہوسکتے یعنی امام حسینؑ کی ذات ہی عزت کامفہوم ایک ایسامفہوم ہے کہ جس کے لئے امام نے اتنی قربانیاں دیں تاکہ امام باقی مقاصدکے ساتھ ساتھ اپنے آپ کواوراپنی زندگی کو ذلت میں نہیں دیکھنا چاہتے تھے اوراسی وجہ سے آپ نے دیگر مقاصدکے ساتھ ساتھ اس مقصدکے حوالے سے بھی اہم ترین کرداراداکیا۔

## عزت کے معنی

باب" عَزَ-یَعِزُّ، ضَرَبَ یَضْرِبُ" سے ہے کہ جو کلام عرب میں عزیز ہونا' قوی ہونا' سخت' محکم اوراستوارکے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔(4)ابتداء زمانہ میں یہ کلمہ جمادات کی توصیف کے لئے استعمال ہوتا تھا جیساکہ کہاجاتا تھا"اَرْض عِزَاز" یعنی محکم زمین۔(5)

راغب اصفہانی فرماتے ہیں: "اَلْعِزَّةُ حَالَة مَالِغَة لِلْاِنْسَانِ مِنْ اَنْ يَغْلَبُ" یعنی: "عزت ایک ایسی حالت ہے کہ جو باعث بنتی ہے کہ انسان پر کوئی غلبہ نہ کرے۔" (6) زجاج عزیز کی تعریف میں لکھتا ہے :"هو الممتنع فلايغلبه شئ"[7] "عزیز ایسی ذات کو کہتے ہیں کہ جس پر کوئی چیز غلبہ نہ کرے۔ چونکہ یہ کلمہ ایک مثبت کلمہ ہے اس لئے مختلف علماء نے اس کے لئے بہت سے کلمات ذکر کیئے ہیں جیسا کہ رفعت' قوت' غلبہ' شدت' معانی رکھتا ہے البتہ یہ مسلم ہے کہ یہ ایک ایسا لفظ ہے کہ ہر انسان کے لئے پسندیدہ ہے اور کوئی بھی شخص اس لفظ کو تنفر کی نظر سے نہیں دیکھتا۔

## عزت' قرآن مجید میں:

قرآن مجید میں لفظ''عزۃ'' کئی مقامات پر آیا ہے البتہ لفظ عزت کبھی مثبت معنی میں آیا ہے اور کبھی منفی معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ کفار کے بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے: الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا) (8) یعنی: "یہ وہ لوگ ہیں جو مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو سرپرست بناتے ہیں کیا وہ ان کے پاس عزت تلاش کرتے ہیں تو بیشک سب عزت اللہ ہی کے لئے ہے۔" اس آیۂ مبارکہ سے پتہ چلتا ہے کہ عزت ایک ایسی چیز ہے کہ جس کا خواہاں ہر شخص ہے چاہے وہ مومن ہو یا کافر چونکہ یہ ایک ایسا مفہوم ہے کہ جو عقل کے نزدیک حَسَن ہے اور اسی وجہ سے کفار بھی یہی چاہتے ہیں کہ وہ عزت کے مالک ہوں اور عزت ان کے پاس ہو لیکن وہ نہیں جانتے کہ عزت کا مالک صرف اور صرف خداوند متعال ہے جو بھی اس عزت کو چاہتا ہے اسے خداوند متعال کے اصول اور دستور العمل کے مطابق اپنی زندگیوں کو استوار کرنا ہوگا تاکہ حقیقی عزت ان کو مل سکے جبکہ خداوند متعال کے علاوہ کوئی اور ذات اور شخصیت ایسی موجود نہیں ہے جس کے پاس عزت ہو اگرچہ بعض غیر مسلم افراد یہ سمجھتے ہیں کہ عزت ان کے پاس ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ عزت اور غلبہ ان کے پاس نہیں ہے ان کے پاس یہ عزت ایک ایسی دلدل ہے کہ جس کو وہ لوگ حقیقت سمجھ بیٹھے ہیں جبکہ یہ حقیقت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

اسی وجہ سے خداوند متعال فرماتا ہے: وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا هُوَالسَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (9) یعنی: ''اور تجھے ان کی بات غم میں نہ ڈالے یقینا سب عزت اللہ ہی کے لئے ہے وہ سب کچھ سننے والا

جاننے والا ہے۔''غلبہ اور عزت فقط خداوند متعال کے پاس ہے اور وہ افراد جو غیر خدا کو ماننے والے ہیں ان کا دعویٰ فقط دعویٰ ہے جبکہ حقیقی عزت صرف خداوند متعال کے پاس ہے۔

## معزز کون؟

قرآن مجید سورۂ منافقون میں ان لوگوں کے لئے فرماتا ہے کہ جو عزت کے حقیقی طور پر مالک ہیں اور عزت ہمیشہ ان کے پاس ہے اوران افراد کے مخالف کبھی بھی اس عزت کے مستحق نہیں ہو سکتے: يَقُوْلُوْنَ لَىِٕنْ رَّجَعْنَاۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (10) یعنی: ''وہ کہتے ہیں اگر ہم مدینہ کی طرف پلٹ گئے تو جو زیادہ عزت دار ہے وہ اس میں سے ذلیل کو ضرور بضرور نکال دے گا اور عزت اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول ﷺ اور مومنین کے لئے ہی ہے لیکن منافق لوگ نہیں جانتے۔''

اس آیۂ مبارکہ میں خداوند متعال نے عزت کو تین افراد کے لئے مختص کیا ہے ایک خود خداوند متعال دوم: رسول گرامی اسلام ﷺ اور سوم: مومنین ۔اوراس عزت کو ذلت کے مقابلے میں قرار دیا ہے یعنی عزت اور ذلت ایک دوسرے کے مقابلے میں ہیں اوراس آیۂ میں عزیز لوگوں کو منافقین کے مقابلے میں قرار دیا گیا ہے پس اگر گذشتہ آیات کو دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ خدا کے مقابلے میں کفار بھی ہیں اور منافقین بھی۔ پس یہ دونوں عزت کے مستحق نہیں ہو سکتے کیونکہ خدااور رسول خدا ﷺ اور مومنین کے خلاف ہیں: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ؕ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَمَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ (11) یعنی: "جو کوئی عزت چاہتا ہے پس اللہ تعالیٰ ہی کے لئے سب عزت ہے اسی کے حضور میں پاکیزہ کلمے بلند ہوتے ہیں اور نیک عمل بھی کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی اس کو بلند کرتا ہے اور جو لوگ برائیوں کی تدبیر کرتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے اور ان کی خفیہ تدبیر وہی تو تباہ ہوں گی۔''

عزت ان بلند کلمات میں سے ہے جنہیں جنہیں بلندی خداوند متعال نے عطا کی ہے جو بھی ان کلمات کو بلندی اوراعمال کو نیکی کی طرف لے کر جائے گا وہ حقیقی معنی میں خداوند متعال کا نمائندہ ہوگا اور جو شخص برائیوں کی تدبیر کرے گا جیسا کہ یزید لعین نے برائیوں کی تدبیر کی، حلال رسول خدا کو حرام اور حرام رسول

خدا ﷺ کو حلال کیا اور دین اسلام کو اس مقام پر پہنچا دیا کہ اسلام اپنی حقیقی شکل کھو رہا تھا اور اسی وجہ سے امام کی ذمہ داری تھی کہ امام ایسے حالات میں اسلام کو دوبارہ حقیقت کی طرف لائیں اگرچہ اس کے لئے انہیں انہیں بڑی سے بڑی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے، وہ اس سے دریغ نہ کریں کیونکہ حقیقی نمائندہ ہی ایسا کر سکتا ہے اور انہیں انہیں وجوہات سے پتہ چلتا ہے کہ دین مبین کا حقیقی نمائندہ کون ہے؟

اسی لئے خداوند متعال نے ان لوگوں کہ جنھوں نے برائیوں کی تدبیر کی ان کے لئے سخت عذاب کی بشارت دی ہے البتہ کہا جا سکتا ہے کہ خداوند متعال نے قرآن مجید میں ایسے الفاظ استعمال کیئے ہیں کہ جن کا معنی مثبت ہے لیکن ان کا استعمال منفی معانی میں بھی کیا ہے جیسے ''بشارت اور آئمہ '' اور ان جیسے دیگر الفاظ کہ جو مثبت معانی میں استعمال ہوتے ہیں لیکن خداوند متعال نے اپنے مخالفین کے لئے بھی استعمال کیئے ہیں: ''فقاتلوا آئمة الکفر'' ، کفر کے اماموں کو قتل کر دو یعنی اس موقع پر خداوند متعال نے آئمہ کفار کے لئے مجاز کے طور پر استعمال کیا ہے اور منفی معنی میں ہے یعنی امام دو قسم کے ہیں ایک امام بر حق اور دوسرا امام کفر اور وہ جو خداوند متعال کا حقیقی نمائندہ ہے اس کو امام بر حق کہا جاتا ہے اور اسی وجہ سے قرآن مجید میں ہے يَوۡمَ نَدۡعُوۡا كُلَّ أُنَاسٍۭ بِإِمَٰمِهِمۡ ''اس دن سب لوگوں کو ان کے امام کے ساتھ بلایا جائے گا''

اگر امام حق ہے تو اس کے ساتھ بلایا جائے گا اور جو امام کفر ہیں ان کو اپنے پیروکاروں کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

## عزت 'روایات میں

روایات معصومین میں بھی اس اصول (عزت) کا خداوند متعال کے ساتھ منسوب ہونا ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اور روایات میں اس اصول کے بارے میں بہت زیادہ کی گئی ہے جیسا کہ حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب فرماتے ہیں: کل عزیزٍ بغیره ذلیل (12) یعنی: "ہر عزیز خداوند متعال کے علاوہ ذلیل ہے۔'' مقصد اور ہدف خداوند متعال ہے جو بھی خدا کے ساتھ ہے یہ عزیز ہے اور یہی عزت اس شخص کے لئے حقیقی عزت ہے لیکن اگر خداوند متعال اس کے ساتھ نہیں ہے تو یہی عزت اس کے لئے ذلت ہے۔ جیسا کہ ایک اور مقام پر امام علی فرماتے ہیں: (العزیز بغیر الله ذلیل) (13) یعنی: "اگر کوئی شخص خداوند متعال کی مدد کے بغیر عزیز ہونا چاہے تو وہ ذلت اور بدبختی سے دوچار ہو جائے گا۔'' اسی وجہ سے امام حضرت علی علیہ السلام اپنی مناجات میں فرماتے ہیں:

(الٰهی کفٰی لی عزاً ان اکون لک عبداً)(14) یعنی: "خدایا! میری عزت کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں۔''اسی طرح امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: من اراد عزاً بلاعشیرة وغنی بلامالٍ وھیبة بلاسلطان فلینقل من ذل معصیة الله الی عزّ طاعته (15) یعنی: "جو کوئی بھی اپنے خاندان کے بغیر عزت چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ بغیر مال کے بے نیاز ہو جائے اور بغیر سلطنت کے ہیبت حاصل کر لے تو وہ خداوند متعال کی نافرمانی سے نکل کر اُس کی کی اطاعت میں آ جائے چونکہ فقط اطاعت میں ہی عزت ہے۔'' ذلت اور عزت دونوں ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے اس لئے کہ یہ دونوں متضاد معانی میں سے ہیں اور ذلت معصیت کے ساتھ ہے اور عزت اطاعت کے ساتھ جب اطاعت خداوندی ہو گی تو عزت بھی اسی شخص کو عطا ہو گی لیکن ضروری ہے کہ اطاعت خداوند متعال کے لئے ہو اور کسی دوسرے کو اس اطاعت میں شریک نہ ٹھہرائے۔

اسی وجہ سے حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں:لاعز اعز من التقویٰ:یعنی: "کوئی عزت تقویٰ سے زیادہ عزیز نہیں ہے۔''(16) عزت جب خدا سے ڈرنا، پرہیزگاری، زہداور ورع جیسی اشیاء کے ساتھ ہو تو حقیقت میں عزت ہو گی لیکن اگر تقویٰ کے مقابلے میں ہو تو یہ ذلت ہو گی امام علیؑ کا قول ہے کہ (لاعزّ کالحلم) یعنی: "کوئی بھی عزت حلم اور بردباری کی طرح نہیں ہے۔''(17)اسی طرح حضرت امیرالمؤمنین علیؑ فرماتے ہیں:اِقْنَعْ تعزّیعنی: "قناعت کرو'تاکہ عزیز ہو جاؤ۔''(18) جب حضرت امام حسینؑ نے اپنے والدبزرگوار سے عزت کی تعریف چاہی توآپ نے فرمایا تھا کہ لوگوں سے بے نیاز ہونے کو عزت کہتے ہیں: سئل الحسین...فما عز المرء؟ قال استغناؤہ عن الناس (19) یعنی: "امام حسین علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ۔۔ایک شخص کی عزت کس میں ہے؟فرمایا: اُس کی لوگوں سے بے نیازی میں۔"

اگر روایات اور قرآن میں دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ عزت خداوند متعال ہی کے ساتھ مختص ہے اور یہ ایک ایسی عطا ہے جو فقط مؤمنین کو عطا کی گئی ہے اور اس کے علاوہ کسی کو بھی اس جیسی عطا سے فیض یاب نہیں کیا گیا اور اگر دیکھا جائے توخداوند کی صفت''رحم'' اسی بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ خداوند متعال رحیم ہے یعنی رحم کرنے والا ہے فقط مومنین پر نہ کہ ہر انسان ،ہر موجود اور ہر ممکن الوجود

پر اسی وجہ سے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:ان اللہ عزّ وجل فوّض الی المؤمن اموره کلّھا ولم یغوض الیه ان یکون ذلیلاً: اما تسمع قول اللہ عز وجل یقول:" وَلِلهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ "فالمؤمن یکون عزیزاً ولایکون ذلیلاً۔ ثم قال انّ المؤمن اعزّ من الجبل۔ انّ الجبل یستقل منه بالمعاول والمؤمن لایستقل من دینه شئ یعنی: "بے شک خداوند متعال نے اپنے تمام امور مومن کو عطا کیئے ہیں البتہ اسے اجازت نہیں دی کہ وہ ذلیل ہو کیا آپ نے نہیں سنا کہ خداوند متعال فرماتا ہے: عزت اللہ، اس کے رسول ﷺ اور مومنین کے لئے ہے پس مؤمن کو ہمیشہ عزیز ہوتا ہے اور کبھی بھی ذلیل نہیں ہوتا پھر آپ نے فرمایا مؤمن پہاڑ سے زیادہ عزیز (سخت) ہوتا ہے کیونکہ پہاڑ کو ابدان سے ریزہ ریزہ کیا جاسکتا ہے لیکن مومن کے دین سے کوئی چیز کبھی بھی کم نہیں ہو سکتی۔''(20)

اس سے ایک اور بات بھی واضح ہوتی ہے کہ مومن اس کو کہتے ہیں جو دین پر ایمان اس طرح لائے کہ اس ایمان میں دوام پایا جائے اور اس کے ایمان میں زیادتی ہو سکتی ہے لیکن کمی نہیں ہو سکتی وہ اساس اور اصل جس کی وجہ سے انسان گمراہی کی طرف چلا جاتا ہے اور دین سے دور ہو جاتا ہے۔ معصومؑ فرماتے ہیں: اللھم عرّفنی نفسک فانک ان لم تعرفنی نفسک لم اعرف رسولک اللھم عرّفنی رسولک فانک ان لم تعرفنی رسولک لم اعرف حجتک اللھم عرّفنی حجتک فانک ان لم تعرفنی حجتک ضللت عن دینک یعنی: "الٰہی! مجھے اپنے نفس کی معرفت عطا فرما اور اگر تو نے اپنے نفس کی معرفت عطا نہ فرمائی تو میں تیرے رسول کی معرفت حاصل نہیں کر سکتا اور اے اللہ! تو مجھے اپنے رسول کی معرفت عطا فرما اور اگر تو نے مجھے اپنے رسول کی معرفت عطا نہ فرمائی تو میں تیری حجت کی معرفت حاصل نہیں کر سکتا بار الٰہا! مجھے اپنی حجت کی معرفت عطا فرما اور اگر تو نے مجھے اپنی حجت کی معرفت عطا نہ فرمائی تو میں تیرے دین سے گمراہ ہو جاؤں گا۔''(21) دین سے گمراہی کے سبب تین ہیں:

1۔عدم معرفت خداوند متعال

2۔عدم معرفت رسول خدا ﷺ

3 ۔امام معصوم کی معرفت نہ ہونا

اگر ان تینوں میں سے کوئی ایک بھی کم ہو جائے تو شخص مومن نہیں رہتا اور قول معصوم کے مطابق مومن وہی ہے جو ان تینوں معرفتوں کو حاصل کر لے ورنہ دین سے بہرہ مند نہیں ہو سکے گا۔

## امام حسینؑ اور عزت

چونکہ اصل مقصد یہ ہے کہ ہم امام حسینؑ کی زندگی میں دیکھیں کہ عزت، امام حسینؑ کے نزدیک کیا حیثیت رکھتی ہے اس وجہ سے اب ہم دیکھتے ہیں کہ امام حسینؑ کے نزدیک عزت اور ذلت کیا ہیں اور عزت جو کہ ہر فرد کے نزدیک حسن ہے اور ذلت جو کہ ہر شخص چاہے مسلمان ہو یا کافر کے نزدیک قبیح اور بری ہے، امام حسینؑ کے اس قیام میں عزت کتنی عظیم شئ ہے کہ امام نے اس عزت کو مقصد اور ہدف قرار دیا ان دیگر اہداف کی طرح امام حسینؑ کا تاکید کرنا عزت پر اور وہ عزت جو قرآن مجید کی نظر میں عزت ہے اسی عزت پر انحصار کیا ہے اسی لئے آپ فرماتے ہیں: الٰهی کفٰی لی عزاً ان اکون لک عبداً یعنی: "خدایا! میری عزت کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں۔''

دعائے عرفہ میں امام حسینؑ مناجات کرتے ہوئے اپنے خدا سے یوں راز و نیاز کرتے ہیں: یامن خصّ نفسه بالسمو و الرفعة واولیائهُ بعزه یعتزون یعنی: "اے وہ ذلت جس کا نفس بلندی اور رفعت کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کے اولیاء اس کی عزت سے تمسک کی وجہ سے عزت پاتے ہیں۔''(22)

پس عزت خداوند متعال کے ساتھ ہے اسی وجہ سے امام فرماتے ہیں کہ '' بارالہا! اگر تجھے پا کر ساری دنیا کو کھو دیا تو سب کچھ پا لیا اور اگر تجھ کو کھو کر سب کچھ پا لیا تو کچھ بھی نہ پایا۔''پس خداوند متعال کو پا لینا ہی ہر قسم کی عظمت کو پا لینا ہے اور خداوند متعال کو پا لینے سے ہی ہر قسم کی عزت، بلندی، عظمت، رفعت اور ہر قسم کی بہترین صفت انسان میں آ جاتی ہیں لیکن اگر خداوند متعال سے دور ہوئے تو کوئی بھی اچھی صفت انسان کے نزدیک نہیں آ سکتی۔

اور پھر آپ نے فرمایا: یامن دعوتهُ ...ذلیلاً فاعزّنی یعنی: "اے وہ کہ جس کو میں نے حالت ذلت میں پکارا بارالٰہا! مجھے عزت عطا فرما۔''(23) ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: انت الله اعززتُ یعنی: "(اے اللہ) تو ہی وہ ذات ہے کہ جس نے مجھے عزت بخشی۔''(24) امام کے مطابق اگر عزت انسان کے پاس ہے تو سب کچھ ہے اور یہ عزت امام نے خداوند متعال کی طرف نسبت دی ہے کہ وہی ذات ہی عزت عطا کرتی

ہے تمام عزتوں کا سرچشمہ ، منبع اور مخزن وہی ذات ہے اسی وجہ سے آپ فرماتے ہیں: (موت فی عزّ خیر من حیاۃ فی ذل) (25) یعنی: "ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے۔''

جیسا کہ ہم نے تاریخ میں دیکھا کہ امام کے نزدیک یزید اور اس جیسوں کی بیعت کرنا ذلت کے مترادف ہے کیونکہ یزید تمام صفات رذیلہ کا پیکر تھا اور صفات حسنہ رکھنے والا شخص صفات رذیلہ رکھنے والے شخص کی بیعت نہیں کر سکتا کیونکہ حقیقت میں یہی ذلت ہے جبکہ اس کے برعکس ذلت نہیں بلکہ عزت ہے یعنی امام جو کہ خداوند متعال کے حکم سے اس منصب پر فائز ہوتا ہے اس کی بیعت میں آنا ہی عزت ہے کیونکہ یہ امامت خداوند متعال نے عطا کی ہے اور عزت ہمیشہ اللہ، اس کے رسول اور مومنین حقیقی کے لئے ہے چونکہ یہ افراد تحت فرمان خداوند متعال ہوتے ہیں اور جو بھی خدا کے فرمان کے سامنے جھک جائے اصل عزت اسی کے لئے ہی ہے اسی وجہ سے آپ نے اور فرامین میں بھی ایسی موت کو سعادت کہا ہے: انی لاارئ الموت الاسعادۃ والحیاۃ مع الظالمین الا برماً یعنی: "میرے نزدیک موت سعادت ہے اور ظالمین کے ساتھ (ان کے حق میں) رہنا ذلت اور رسوائی ہے۔'' (26)

سعادت و شقاوت، عزت وذلت، حسن و قبیح، عدل اور جھوٹ ان تمام الفاظ اور مفاہیم سے پتہ چلتا ہے کہ دو راستے ہیں اور تیسرا راستہ وجود نہیں رکھتا ایک اچھا اور حسن راستہ اور دوسرا بُرا راستہ اور اگر انسان کو ابتدائے آفرینش سے دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ مقصد خدا بھی یہی تھا کہ انسان کوئی ایک راستہ اپنے لئے منتخب کرے: اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا یعنی: "ہم نے انسان کی راستوں کی طرف ہدایت کر دی چاہے تو وہ شکر کرے اور چاہے کفر کرے۔'' (27)

ضروری ہے کہ انسان اپنا ہدف معین کرے کہ اس کا راستہ کون سا ہے امام حسینؑ کا راستہ اس کا راستہ ہے یا پھر یزید لعین کا راستہ اس کا راستہ ہے چونکہ تیسرا راستہ موجود نہیں ہے یعنی یا حزب اللہ ہے یا پھر حزب الشیطان ہے پس ضرورت ہے اس امر کی کہ انسان اپنا ہدف معین کرے بغیر ہدف معین کئے اس کی زندگی ایک چوپائے کی زندگی ہوگی کہ جس کا کوئی مقصد اور ہدف نہیں ہوتا امام حسینؑ فرماتے ہیں: مرحباً بالقتل فی سبیل اللہ ولکنکم لاتقدرون علی ھدم مجدی ومھو عزی وشرفی فاذاً لاابالی بالقتل یعنی: "خداوند متعال کے راستے میں موت بہترین موت ہے لیکن مجھے قتل کرنے سے تم میری بزرگی وعظمت' عزت اور میرے شرف کو کم نہ کر سکو گے کیونکہ میں موت سے نہیں ڈرتا۔'' (28)

پتہ چلاکہ وہ موت جو منبع حقیقی (خداوند متعال) سے متصل ہوایسی موت کسی قسم کے زوال کا باعث نہیں ہے اورایسی موت اسی وجہ سے خوف کا باعث نہیں ہے ضروری ہے کہ انسان خدا کی معرفت رکھتا ہواوراسے معلوم ہو کہ بازگشت اور پلٹ کر جانا صرف خدا کی طرف ہے۔

## عزت اور سیرت امام حسینؑ

1۔امام حسینؑ کی سیرت کے کچھ پہلو ایسے ملتے ہیں جن سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ امام حسینؑ کی سیرت میں عزت کا کیا کردار ہے جیسا کہ امام کی شہادت سے قبل آپ نے فرمایا کہ میں جب شہادت کے لئے جاؤں تو مجھے کم اہمیت لباس دیں تاکہ میں وہ پہن کر میدان جنگ کی طرف جاؤں جبکہ روایت میں ملتا ہے کہ آپ کو (تُبّان) خاص لباس دیا گیا کہ وہ پہن کر جائیں تو آپ نے اس کو قبول نہیں کیا اور فرمایا: لا ذاک لباس من ضربت علیه بالذلة یعنی: "نہیں یہ لباس اس کا ہے جو ذلت سے دوچار ہے۔''(29)

2۔جب ولید نے امام حسینؑ سے بیعت لینی چاہی اور آپ نے یزید کی بیعت سے انکار کیا تو مروان بن حکم نے آپ کو قتل کی دھمکی دی تو آپ نے مروان سے یوں فرمایا: ''مجھے خداوند متعال کی قسم! اگر کوئی مجھے قتل کرنا چاہے اس سے پہلے کہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہوں اس کے خون سے زمین کو سیراب کردوں گا (اے مروان) اگر تو چاہتا ہے کہ میری بات کی سچائی کو پائے تو یہ عمل کرکے دیکھ لو تمہیں اس کا جواب دے دوں گا۔''(30) اور پھر امام حسینؑ نے ولید سے کہا: ایھا الامیر! انااھل بیت النبوة ومعدن الرسالة ومختلف الملائکه وبنا فتح الله وبنا ختم ویزید رجل فاسق شارب الخمر قاتل النفس المحترمة معلن بالفسق مثلی لایبایع لمثله یعنی: "اے امیر! میں اہل بیتؑ رسالت ﷺ کے معادن میں سے ہوں اور ہم ہی الملائکہ کے بار بار نزول کی جگہ ہیں اور خداوند متعال نے ہمارے ذریعے ہی ابتدا کی ہے اور ہم ہی پر اختتام کیا ہے اور یزید فاسق شخص، شراب خور اور نفس محترمہ کا قاتل ہے اور اعلانیہ طور پر فسق وفجور انجام دیتا ہے اور مجھ جیسا یزید جیسے کی بیعت نہیں کرسکتا۔"(31)

3۔جب محمد حنفیہؒ سے بات ہوئی تو آپ نے یزید کی بیعت کے بارے میں یوں فرمایا: یا اخی! والله لولم یکن فی الدنیا ملجأ ولامأویً لما بایعت والله یزید ابن معاویه ابداًیعنی: "اے میرے بھائی! خدا کی قسم اگر روی زمین پر میرے لئے کوئی ٹھکانہ اور پناہ گاہ بھی باقی نہ رہے تب بھی میں یزید

ابن معاویہ کی کبھی بھی بیعت نہیں کروں گا۔''(32) ان تمام الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے نزدیک یزید کی بیعت کرنا کتنا قابل نفرت کام تھا کہ جو آپ کسی حالت میں بھی انجام نہیں دے سکتے چاہے اس کے لئے آپ کے پاس روی زمین پر ایک ٹکڑا بھی باقی نہ رہے پس آپ موت کو سعادت سمجھتے تھے اور بیعت جیسے کام کو انتہائی برا اور گناہ سمجھتے تھے۔

4۔امام حسینؑ کی جب ملاقات کوفہ کے راستے میں فرزدق سے ہوئی تو آپ نے فرزدق سے فرمایا:وانا اولیٰ من قام بنصرة دین الله واعزاز شرعه والجهاد فی سبیل الله لتکون کلمة الله هی العلیاء یعنی: "میں سب سے اولیٰ اور بہتر ہوں کہ خدا کے دین کی نصرت کے لئے کھڑا ہو جاؤں اور شریعت کو عزت بخشنے کے لئے جہاد کروں اللہ کے راستے میں تاکہ کلمتہ اللہ ہی بلند ہو۔''(33) امام حسین علیہ السلام یزید کے خلاف قیام کو اپنی ذمہ داری سمجھ رہے ہیں اور اگر اس وقت کے تمام افراد کو دیکھا جائے تو تنہا حضرت امام حسینؑ ہیں کہ جو اس ذمہ داری کو انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ویسے بھی یہ قیام تمام عالم اسلام پر واجب تھا لیکن اس وجوب کو عملی جامہ پہنانے کے لئے فقط امام حسینؑ ہی آگے بڑھے اور اس کام کو انجام دیا۔

امام حسینؑ نے عاشور سے قبل اور روز عاشور بہت سارے اعمال انجام دیئے کہ جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امام عزت کے خواہاں تھے اور یزید کے تمام اعمال کو لوگوں کے سامنے بیان کیا اور نہ صرف یزید بلکہ یزیدی فوج کے ایک ایک فرد کے کرتوتوں کو لوگوں کے سامنے بیان کیا اور انہیں انہیں لوگوں کے سامنے ذلیل کیا جیسا کہ فوج اشقیاء کے سامنے حجت کو تمام کرنے کے لئے عبیداللہ ابن زیاد کے بارے میں فرماتے ہیں:الا ان الدعی ابن الدعی قد رکز بین اثنتین بین السلة والذلة وهیهات منا الذلة۔یأبی الله ذالک لنا و رسوله والمومنون وحجور طابت وطهرت وانوف حمیة ونفوس ابیة من ان نؤثر طاعته اللئام علی مصارع الکرام۔الا وانی نراحف بهذه الاسرة مع قلة العدد وخذلان الناصر یعنی: "آگاہ رہو' زنازادہ ابن زنازادہ (ابن زیاد) نے مجھے دو چیزوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کو کہا ہے یا تلوار نکال کر جنگ کے لئے آمادہ رہوں یا پھر ذلت کا لبادہ اوڑھ لوں (یزید کی بیعت کروں) لیکن ذلت مجھ سے بڑی دور ہے جبکہ خدا، رسول خداﷺ ، مومن اور پاک دامن افراد ہم سے اس قسم کے کام کی توقع رکھتے کہ اطاعت کی ذلت کو قتل ہونے پر کریم

اور بزرگوں کی طرح ترجیح نہ دیں جان لو اگرچہ میرے پاس مددگار انتہائی کم ہیں پھر بھی تم سے جنگ کروں گا۔''(34)اور پھر امام ،فوج اشقیاء کو اپنی صفات بتاتے ہوئے ان اشعار کو بصورت رجز پڑھا:

انا ابن علی الطهر من آل هاشم　　　کفانی بهذا مفخراً حین افخر

وجدی رسول الله اکرم من مضی　　　ونحن سراج الله فی الارض نزهر

وفاطمة ای من سلالة احمد وعمی یدعی ذوالجناحین جعفر

وفینا کتاب الله انزل صادقاً　　　وفینا الهُدیٰ والوحی بالخیریذکر(35)

یعنی: "میں علیؑ مطہر جو خاندان ھاشم میں سے ہے ان کا بیٹا ہوں اور میرے لئے یہ افتخار جب میں فخر کروں کفایت کرتا ہوں ، میرے جد حضرت رسول اکرم ﷺ بزرگ ترین افراد میں سے ہیں اور ہم خدا وند متعال کے چراغ اور نور ہیں کہ جو زمین پر اہل زمین کو منور کرتا ہے میری ماں حضرت فاطمۃ الزھراءؑ حضرت احمد مرسل ﷺ کی نسل ہیں اور میرے چچا جعفر ہیں جن کو خداوند متعال نے پر عطا کئے تھے ہمارے خاندان میں خداوند متعال کی سچی کتاب نازل ہوئی اور ہمارا خاندان ہی ہدایت ، وحی کا خاندان ہے جب کوئی ذکر کرے تو ان اسماء سے مشہور ہوتا ہے۔''

یہ وہ اعزاز ہیں جو امام نے اپنے لئے ذکر کئے اور تمام عالم اسلام کو بتایا کہ ہم ہی معزز ترین افراد ہیں خداوند متعال کے نزدیک اور ہم ہی ہر صفت کے لحاظ سے اور خاندان کے لحاظ سے ہم سے پاکیزہ ترین خاندان وجود نہیں رکھتا۔اسی وجہ سے آپ نے دشمن کی ذلت کے پہلوؤں کو بھی ذکر کیا اور فرمایا کہ: ویلکم یاشیعة آل ابی سفیان ان لم یکن لکم دین وکنتم لایتخافون المعاد فکونوا احراراً فی دیناکم هذه وارجعوا الیٰ احسابکم ان کنتم اعراباً کما تزعمون یعنی: "ویل ہو تم پر اے آل ابوسفیان کے شیعو! اگر تمہارے پاس دین نہیں ہے اور تم معاد اور قیامت سے نہیں ڈرتے تو کم از کم اپنی دنیا میں آزاد رہو اور اپنے حسب نسب کی طرف پلٹ جاؤ اور تم عرب ہو جیسا کہ تمہارا گمان ہے۔''

☆☆☆☆

## حوالہ جات

1۔ سموالمعنی فی سموالذات، ص۱۰۵
2۔ تاریخ طبری، ج۴، ص ۲۶۶۔ الکامل فی التاریخ، ج۴، ص ۲۳۔
3۔ القرآن
4۔ المنجد، کلمہ عز
5۔ معجم مفردات الفاظ قرآن۔ راغب اصفہانی۔ چاپ بیروت۔
6۔ مفردات الفاظ قرآن۔ راغب اصفہانی۔ چاپ بیروت۔
7۔ لسان العرب۔ ابن منظور جلد۹۔
8۔ سورۂ نساء ۱۳۹۔
9۔ سورۂ یونس ۶۵۔
10۔ سورۂ منافقون ۸۔
11۔ سورۂ فاطر ۱۵۔
12 ۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۶۵۔
13۔ منتخب میزان الحکمۃ، محمدی ری شہری۔ بحار الانوار، ج۷۸، حدیث ۶۷۔
14۔ خصائل شیخ صدوق، ص ۴۲۰۔
15۔ خصائل شیخ صدوق، ص ۲۲۲۔
16۔ نہج البلاغہ، کلمات قصار، ۳۷۱۔
17۔ نہج البلاغہ، کلمات قصار، ۱۱۳۔
18۔ منتخب میزان الحکمۃ، ۳۴۶۔
19۔ بحار الانوار، ج۳۶، ص ۳۸۴۔
20۔ کافی، محمد یعقوب کلینی، تصیح و تعلیق علی اکبر غفاری، ج۵، ص ۶۳۔
21۔ مفاتیح الجنان۔
22۔ موسوعۃ کلمات امام حسین، ص۷۹۷۔ مفاتیح الجنان، دعای عرفہ۔
23۔ موسوعۃ کلمات امام حسین، ص۷۹۸۔ مفاتیح الجنان، دعای عرفہ۔
24۔ موسوعۃ کلمات امام حسین، ص۷۹۹۔ مفاتیح الجنان، دعای عرفہ۔
25۔ بحار الانوار، ج ۲۴، ص ۱۹۲۔
26۔ بحار الانوار، ج ۲۴، ص ۱۹۲۔
27 ۔ القرآن۔

28۔ موسوعۃ کلمات امام حسینؑ، ج١١، ص١٠٦۔
29۔ بحارالانوار، ج۴۵، ص۵۴۔
30۔ کتاب المفتوح، ابو محمد احمد بن اثمم کوفی، ج۵، ص۱۴۔
31۔ کتاب المفتوح، ابو محمد احمد بن اثمم کوفی، ج۵، ص۱۴۔
32۔ کتاب المفتوح، ابو محمد احمد بن اثمم کوفی، ج۵، ص۲۱۔
33۔ موسوعۃ کلمات امام حسینؑ، ص۳۳۶۔
34۔ لہوف، ص۱۲۳'۱۲۴۔
35۔ بحارالانوار، ج۴۵، ص۴۹۔

# کتابیات امام حسینؑ
# Bibliography of Imam Hussain(as)

سید محمد علی ترمذی

فن کتابیات (Biblio Graphy) کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ عام وخاص قارئین کی رسائی ان مآخذ تک کرادی جائے جوان کے موضوع یا موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں علوم کی موجودہ تقسیم کے مطابق کتابیات لائبریری سائنس کے ایک جزولاینفک ہے کیونکہ اس علم اور فن تحقیق کاآپس میں چولی دامن کاساتھ ہے اس لئے کتابیات کو کسی بھی موضوع کی تحقیق کی خشت اول قرار دے دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا تحقیق کاتوپہلازینہ ہی ان منابع کو جاننا ہے جن سے متعلقہ موضوع پر مفید معلومات فراہم ہوسکتی ہیں اور ایسے منابع کاپتہ کتابیات ہی سے چلتا ہے۔

کئی علوم کی طرح کتابیات کاسنگ بنیاد بھی مسلمانوں ہی نے رکھا اوراس سلسلے میں ایسی شاندار روایات قائم کیں کہ آج بھی لائبریری سائنس کے بڑے بڑے مغربی ماہرین سراہتے ہوئے مسلمانوں کی بلند پایہ خدمات کوخراج تحسین پیش کرتے نظرآتے ہیں اس ضمن میں ہونے والی مسلمانوں کی کاوشوں میں سے تین مصادر کاذکر کردینا ہی کافی ہے ان میں ایک تو''ابن الندیم'' ہے جس کی الفہرست اتنی صدیاں گذرجانے کے باوجود مستند ترین مصادر میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کے بعد حاجی خلیفہ کی ''کشف الظنون'' ہے اوراس عہد میں آغا بزرگ طہرانی کی ''الذریعہ الیٰ تصانیف الشیعہ'' ہے جس کواب اضافوں کے ساتھ نئے سرے سے شائع کیاگیا ہے افسوس کہ مسلمانوں کی قائم کردہ یہ قابل قدر روایات زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکیں اور دیگر علوم کی طرح انہیں بھی اغیار لے گئے اور پھر بناسنوار کرایک مکمل علم کے درجے تک پہنچادیا۔

زیر نظر مضمون میں امام عالی مقام حسین علیہ السلام کی زندگی اور تحریک کربلاکے حوالے سے لکھی جانے والی کتب کاجائزہ لیں گے۔امام عالی مقام حسینؑ عالم اسلام کی ان شخصیات میں سے ایک ہیں جن کہ بارے میں سب سے زیادہ لکھاگیا گوکہ ان چنداوراق پران کااحاطہ کرنا ناممکن ہے مگر کوشش کی گئی ہے

کہ پڑھنے والا ابتدائی معلومات سے بہرہ مند ہوسکے سر دست میری نظر میں کتابیات امام حسینؑ پر تین حوالے موجود ہیں کہ جن سے رجوع کرنے سے موضوع کے متعلق سیر حاصل معلومات میسر آسکیں گئیں گو کہ مذکورہ مآخذ کسی طرح بھی مکمل آگاہی نہ دے سکیں گے مگر شائقین تحقیق و جستجو کے لئے زینہ ضرور فراہم کر سکتے ہیں۔

پہلا مجموعہ سید حسین عارف نقوی کا مرتب کردہ ''بر صغیر کے امامیہ مصنفقین کی مطبوعہ تصانیف اورتراجم'' جسے مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد نے شائع کیا ہے اس مجموعہ میں کتاب کا نام ،مصنف کا نام، سن اشاعت، ناشر کا نام ومقام وغیرہ کے علاوہ چند سطر وں میں کتاب کا خلاصہ یا عنوانات کہ جن کا تذکرہ اس کتاب میں ہوا درج ہے۔

دوسرا مجموعہ جو میرے پیش نظر ہے وہ دارالثقافۃ الاسلامیہ پاکستان کی کراچی کی شائع کردہ ہے جسے سید علی شرف الدین موسوی نے تالیف کیا ہے اس کا سن اشاعت مارچ ۲۰۰۱ء ہے اس کا نام '' معجم کتب و مولفین حیات وقیام امام حسینؑ'' ہے اس میں عربی، فارسی اور اردو زبان میں لکھی جانے والی کتب کا تذکرہ ہے جس کی تعداد دوہزار سات سوپچیس (2725) ہے اس میں کتاب کا نام، مصنف کا نام ، ناشر اور کتاب کتنے صفحات پر مشتمل ہے درج ہے کتاب کے آخر میں مولف نے بعض مصنفین اور مولفین کے مختصر حالات زندگی بھی تحریر کیے ہیں نیز تین سو باسٹھ مضامین کے حوالہ جات بھی درج ہیں

تیسرا مجموعہ کتابیات امام حسینؑ ہے جسے سید جمیل احمد رضوی سابقہ ڈپٹی چیف لائبریرین پنجاب یونیورسٹی لاہور نے مرتب کیا ہے اس میں پاکستان میں شائع ہونے والی کتب کا تعارف کروایا گیا ہے کیونکہ مولف خود لائبریری سائنس کے سینئر اساتذہ میں سے شمار ہوتے ہیں اس لئے اس مجموعہ کو متعلقہ علم کے اصول و قواعد کے مطابق مرتب کیا ہے۔ یہاں چند اہم کتب کا تعارف کروایا جارہا ہے:

## کتاب: شہید انسانیت

مصنف: سیدالعلماء سید علی نقی نقوی؛ سن اشاعت: 2006ء؛ بار اشاعت: ہشتم؛ ناشر: امامیہ مشن پاکستان لاہور۔

اس کتاب کے مصنف برصغیر کی تاریخ تشیع میں نادر روزگار شخصیت تھے آپ کا شمار ہندو پاک ان جید و ممتاز علماء میں ہوتا ہے جو درجہ اجتہاد پر فائز تھے علی گڑھ یونیورسٹی میں ''شعبہ دینیات'' کے ڈی این کی حیثیت سے ریٹائرڈ ہوئے امامیہ مشن کے بانی تھے تفسیر قرآن مجید کے علاوہ مختلف موضوعات پر کثیر کتب تحریر فرمائیں اس کے علاوہ موصوف اپنی طرز کے بہترین مقرر تھے آپ اپنی زندگی کے آخری ایام میں تین سال پاکستان تشریف لاتے رہے اور ایام عزا میں مجالس سے خطاب کرتے تھے بندۂ ناچیز کو لاہور میں موصوف کی مجالس سننے اور قریب سے زیارت کرنے کا شرف حاصل رہا ہے۔

یہ کتاب واقعہ کربلا کے تیرہ سو برس مکمل ہونے پر یعنی ۱۳۶۱ھ میں لکھی گئی اردو زبان میں لکھی جانے والی امام حسینؑ کی سیرت و سوانح کے موضوع پر ایک مستند ترین کتب میں سے ایک ہے یہ اہل زبان کے قلم سے نکلی ہوئی ایک تحریر ہے جس نے اسے مذید مقبول بنادیا ہے اس کتاب کا مقدمہ علامہ سید محمد جعفر زیدی شہید، خطیب جامع مسجد اسلام پورہ نے تحریر کیا ہے اس کتاب میں امام عالی مقام کے خاندانی پس منظر سے لے کر توابین اور بنی عباس کی حکومت کے قیام تک کے واقعات حالات اور ان کا تجزیہ موجود ہے اس کتاب کے تینتالیس (43) باب ہیں اور آخر میں عالم انسانی کو اصلاح عمل اور اتباع اسوہ حسینی کی دعوت دی گئی ہے حاشیہ پر ضروری حوالہ جات درج ہیں جو کتاب کی تحقیقی حیثیت کو اجاگر کرتے ہیں نمونہ کے طور پر ایک مختصر سا پیرا قارئین کے ذوق مطالعہ کی نذر ہے:

''حسینؑ اس وقت بھی حسینؑ ہی رہتے کہ جب آپ صرف اپنے تمام اصحاب و اعزہ کے ساتھ شہید ہو جاتے اور اپنے جہاد کو اپنی زندگی کے خاتمہ ہی پر ختم کرتے مگر اس وقت حسینؑ میدان جہاد میں اور بھی بلند نظر آئے جب آپ نے اپنی شہادت کے بعد کے لئے اس شہادت کے مقاصد کی اشاعت کا انتظام کی اپنے حرم اور چھوٹے بچوں کو ساتھ لا کر جن میں سے ہر ایک میں فرض شناسی اور حقیقت پروری اس طرح سرایت کئے ہوئے تھی کہ ابن زیاد کے دربار اور یزید کے قصر میں بھی پسماندگان میں سے کسی ایک متنفس نے اموی حکومت کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا یعنی وہ بیعت کا انکار جس پر حسینؑ کا سر نیزہ پر پہنچ گیا اب بھی قائم تھا اور اب اس کے علمبردار سید سجادؑ، زینبؑ و کلثومؑ ہی نہیں بلکہ کمسن بچے، فاطمہؑ، سکینہؑ اور محمد باقرؑ بھی تھے۔''

## کتاب: پیشوائے شہیداں

نام مصنف: سید رضا صدر؛ مترجم: مولانا محمد عباس قمی؛ ناشر: امامیہ پبلی کیشنز لاہور؛ سال: ۲۰۰۱ء؛ بار اشاعت: سوم۔

فارسی زبان سے اردو زبان میں ترجمہ کی گئی سید رضا صدر کی کتاب پیشوائے شہیداں کتابیات امام حسینؑ میں ایک گراں قدر اضافہ ہے اس کتاب میں مصنف نے نہ تو تاریخ لکھی ہے نہ واقعہ نگاری سے براہ راست تعلق رکھا ہے بلکہ انہوں نے واقعات کے پردے میں مخفی محرکات اور پوشیدہ مطالب کا تجزیہ کیا ہے سید سجاد رضوی کے بقول جنہوں نے اس کتاب کا مقدمہ لکھا ہے کہ ''لکھنے والے نے اپنی پوری ادبی تخلیقی طاقت کو اس کتاب کی تحریر میں صرف کیا ہے کہ ایک بار فارسی کتاب شروع کردے تو چھوڑنے کی جی نہیں چاہتا......ایسی کتاب اردو میں موجود نہیں اور جیسا کہ کہا جاچکا ہے کہ فارسی یا عربی میں بھی موجود نہیں راقم کی رائے یہ ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ اردو زبان کے کربلائی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ مصنف عزاداری کی اہمیت پر تحریر کرتے ہیں:

''شہید کی عزاداری کرنا اس کی شہادت کو زندہ رکھنا ہے بنت علی کی اسیری نے سیدالشداء کی شہادت کو دوام جاودان عطا کی ہے اگر پیشوائے شہدا کی سوگواری نہ ہوتی تو آج کوئی حسینؑ کا شناسا نہ ہوتا...شہیدی عزاداری فرد اور معاشرے کو شہید شناس بنادیتی ہے...شہید کی عزاداری ظالم کے خلاف فطری نفرت کو برانگیختہ کرتی ہے...آنسو راہ حسینؑ کی طرف دعوت (کاذریعہ) ہیں (مگر) یہ دعوت اشک زبان و قلم کا ذریعہ نہیں بلکہ دل کے ذریعے سے ہوتی ہے۔

## نام کتاب: امام پاک اور یزید پلید

مصنف: مجدد مسلک اھل سنت علامہ محمد شفیع اوکاڑوی؛ سن اشاعت: ۱۹۹۰ء؛ بار اشاعت: چہارم؛ ناشر: جناء القرآن پبلی کیشنز لاہور۔

یہ اہل سنت کی جانب سے امام عالی مقام کی بارگاہ میں ایک عقیدت کا اظہار ہے ''یزیدی فرقے'' کے پرچارک محمود احمد عباسی نے خلاف معاویہ و یزید نیز مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب خلافت اور ملوکیت پر تنقید بعنوان تبصرہ محمودی بر ہفوات مودودی (ان کے دو کتابوں کے جواب میں) اھل سنت کے

خطیب، عالم اور مصنف علامہ محمد شفیع اوکاڑوی نے زیر نظر کتاب تحریر کی ہے اس میں مصنف نے جہاں یزیدی فرقے سے اظہار بیزاری کیا ہے وہاں امام حسینؑ کی عظمت، منزلت، کردار اور قیام کو حق بجانب قرار دیا ہے اہل بیت اطہار سے اپنی محبت کااظہار کیا ہے موصوف نے قرآنی آیات، احادیث مبارک، تاریخی اور عقلی دلائل سے اپنے موقف کو پیش کیا ہے کتاب کے آخر میں مصنف تحریر کرتے ہیں:

''ان ارشادات مبارکہ کے مطابق ہی اہل سنت وجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ ان کی محبت سرمایہ ایمان، ذریعہ قرب خدا تعالیٰ اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور وسیلہ نجات ہے چنانچہ اکابر اہل سنت نے بلحاظ مدارج ان کے اسماء مبارکہ خطبہ جمعہ میں داخل فرمائے تاکہ ہر جمعہ کو برسر منبر اس عقیدہ کااظہار وبیان ہوتا رہے اور مسلمانوں کے دلوں میں ان کی محبت وعقیدت مستحکم رہے۔ لہٰذا جو ان کی ذات اقدس پر نکتہ چینی کرے اوران کی طرف بغض وحسد، حب جاہ اور ہوس اقتدار کی نسبت کرے اور ان کو باغی، فسادی اور فتنہ پرور قرار دے اور قرآن وحدیث سے ثابت شدہ ان کے فضائل ومناقب کو محض خیالی مناقب بتائے وہ بلاشبہ اھل سنت وجماعت سے خارج، گمراہ، بے دین اور جہنمی ہے۔''

یہاں تبرکاً چند کتب کے حوالہ جات درج کیے جاتے ہیں:

### نام کتاب: سخن عشق

یہ شہید علامہ عارف حسین الحسینی کی مجالس عزا کا مجموعہ ہے جسے العارف اکیڈمی لاہور نے مرتب کیا ہے۔

بار اشاعت: اول؛ سن اشاعت: ۱۹۹۶ء

### گفتار عاشورا

تدوین: رضا حسین رضوانی؛ ترجمہ: مستجاب احمد انصاری؛ ناشر: جامعہ تعلیمات اسلامی۔

یہ کتاب آیت اللہ محمود موسوی طالقانی، آیت اللہ شہید مرتضیٰ مطہری، آیت اللہ محمد حسینی بہشتی اور ڈاکٹر محمد ابراہیم امینی کی پانچ تقاریر کا مجموعہ ہے۔ ان تقاریر کے موضوعات یہ ہیں: (۱) جہاد حسینی کے اسباب؛ (۲) کامیاب جدوجہد؛ (۳) جہاد وشہادت؛ (۴) خطبہ اور منبر (دو تقاریر)۔

## نام کتاب: عنوان عاشورہ

ناشر: دار الثقافہ الاسلامیہ پاکستان کراچی؛ بار اشاعت: اول؛ سن اشاعت: ۱۴۲۲ھ۔

یہ چھ مقالہ جات کا مجموعہ ہے جس میں آیت اللہ شہید سید محمد باقر الصدر اور شہید آیت اللہ سید محمد حسین بہشتی کے مقالاجات بھی شامل ہیں یہ مقالہ جات ان موضوعات پر ہیں:

(۱) امت کے ہزیمت خوردہ اخلاق کی اصلاح　(۲) شہادت حسینؑ ایک آگاہانہ اقدام

(۳) سید الشہداؑء کا کامیاب جہاد　(۴) انقلاب کربلا ایک تاریخی جائزہ

(۵) عنوان عاشورہ　(۶) میدان جنگ میں امام حسینؑ کے خطبات

## نام کتاب: سعادة الدارین فی مقتل الحسین

مصنف: علامہ محمد حسین نجفی؛ ناشر: مکتبہ السبطین سرگودھا؛ سن اشاعت: ۱۹۷۱ء؛ باراشاعت: اول۔

یہ علامہ محمد حسین نجفی کی کتاب امام حسینؑ کے حالات وواقعات، خاندانی پس منظر اور کربلا کے واقعات وغیرہ پر ایک مفصل کتاب ہے جس میں مصنف نے قرآن، حدیث اور تاریخی حوالہ جات کو درج کرنے کے بعد اپنا موقف بیان بھی کیا ہے یہ اپنے حوالے سے ایک جامع کتاب ہے گو کہ مصنف کا انداز بیان اور زبان دلکش نہیں ہے بعض افراد نے مصنف کے خیالات سے اختلاف بھی کیا ہے۔

## نام کتاب: ذکر حسینؑ

مصنف: سید افضال حیدر ایڈوکیٹ؛ ناشر: دوست پبلی کیشنز؛ سال اشاعت: ۲۰۰۴ء؛ باراشاعت: اول۔

یہ کتاب ممتاز قانون دان، اسلامی نظریاتی کونسل کے سابقہ رکن اور سابقہ وزیر قانون سید افضل حید ایڈوکیٹ نے تحریر کی ہے اس میں امام عالی مقام کے حالات، جدوجہد پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے اس میں یہ موضوعات ہیں مصلح، انقلابی یا باغی، آغوش رسالت ﷺ سے راہ عمل تک، ملوکیت کا عروج وزوال، سفر عشق، مکہ سے کربلا تک، اس میں میں شہداء کربلا کے مختصر حالات زندگی اور اھل بیت کی شان قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان کی گئی ہے۔

## حسینؑ ابن علیؑ

یہ کتاب بھی سید افضال حیدر ایڈوکیٹ نے تحریر کی ہے۔ اس کتاب میں امام حسینؑ کے دور کے حالات اور امام کے فریضہ پر بحث کی ہے موضوعات میں سے چند ایک یہ ہیں: امر بالمعروف و نہی عن المنکر، ذبح عظیم اور فلسفہ شہادت، علی اور بنوامیہ، قیام حسینؑ کا پس منظر، کربلا، کوفہ اور شام، حضرت ابراہیمؑ سے لے کر امام زمانہ تک کا منتخب شجرہ اور اہم افراد شجرہ کے حالات اس کتاب میں جہاں دیگر اردو، فارسی کتب سے مدد لی گئی ہے وہاں برجستہ اشعار کا سہارا بھی لیا گیا ہے مثلاً کتاب کے شروع میں شورش کاشمیری کا یہ شعر درج ہے:

کربلا کا سیدھا سادا مختصر نکتہ ہے یہ　　　　کوئی غاصب مومنوں کا بن نہیں سکتا امام

**نام کتاب: سیرت سید الشہداء حضرت امام حسینؑ** (دو جلدیں):

مولف: عمادالدین اصفہانی عماد زادہ؛ مترجم: محمد حسین زیدی بارہوی؛ ناشر: امامیہ پبلی کیشنز لاہور۔

یہ کتاب فارسی زبان سے اردو زبان میں منتقل ہوئی ہے جس کی پہلی جلد میں ولادت امام عالی مقام سے لے کر شہادت تک کے واقعات درج ہیں دوسری جلد میں شہدائے کربلا کے حالات اور کربلا کے بعد کے واقعات درج ہیں۔

## قرآن اور امام حسینؑ

نام کتاب: قرآن اور امام حسینؑ؛ مصنف: استاد محسن قرائتی؛ مترجم: سید محمد علی ترمذی؛ ناشر: البیان لاہور، سن اشاعت: ۲۰۰۷ء۔

استاد محسن قرائتی نے قرآن اور امام حسینؑ کی خوبصورت تطبیق کی ہے نیز کربلا کی تفسیر، امام عالی مقام کا موقف اور امام نے جہاں جہاں قرآن پاک سے استنبداد کیا ہے' تذکرہ کیا ہے شہادت، جہاد، امر بالمعروف نہی عن المنکر اور نماز کی اہمیت کو قرآن کی روشنی میں کربلا کے میدان جلوہ گر ہوتے دکھایا گیا ہے ناشر نے کتاب کے شروع ہیں آقائے قرائتی کا ایک خط بھی شامل کیا ہے جس میں مولف نے حوزہ علمیہ کے زعماء سے قرآن مجید سے مزید رجوع کرنے کی درخواست کی ہے یہ کتاب اپنے حوالے سے کتابیات امام حسینؑ میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

**نوٹ:** قارئین کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ موضوع پر کیونکہ بہت زیادہ کتب موجود ہیں۔ اس لئے چند کتب کاانتخاب کیا گیا ہے ورنہ زندگی کم ہے اور امام حسینؑ پر کتب بہت زیادہ ہیں۔

سہ ماہی **نور معرفت**

## ممبر شپ فارم

نام: ______________________ تعلیم: ______________________

پیشہ: ______________________ فون نمبر: ______________________

پتہ: ______________________________________________

______________________________________________

E-mail: ______________________________________________

براہ کرم سال ________ کے لئے نور معرفت میرے نام جاری کر دیجئے۔ شکریہ دستخط خریدار: ________

## دفتری استعمال کے لئے

برادر/خواہر ____________ کی ممبر شپ برائے سال ________ کی درخواست منظور کرتے ہوئے رجسٹریشن نمبر جاری کر دیا گیا ہے متعلقہ ممبر کو مجلّہ باقاعدگی سے ارسال کیا جائے گا۔

رجسٹریشن نمبر: ____________ تاریخ اجراء: ____________ ممبر ساز: ____________

نوٹ: مجلّہ کا 2015ء کے لئے زرِ سالانہ مبلغ :/500 روپے اور فی شمارہ :/130 روپے ہے۔

خط وکتابت کا پتہ:

سہ ماہی نور معرفت/نوری الہدیٰ مرکز تحقیقات/نور الہدیٰ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

سادات کالونی/بارہ کہو اسلام آباد/فون: 051-2231937

www.nht.org.pk, www.nmt.org.pk

E-mail:noor.marfat@gmail.com

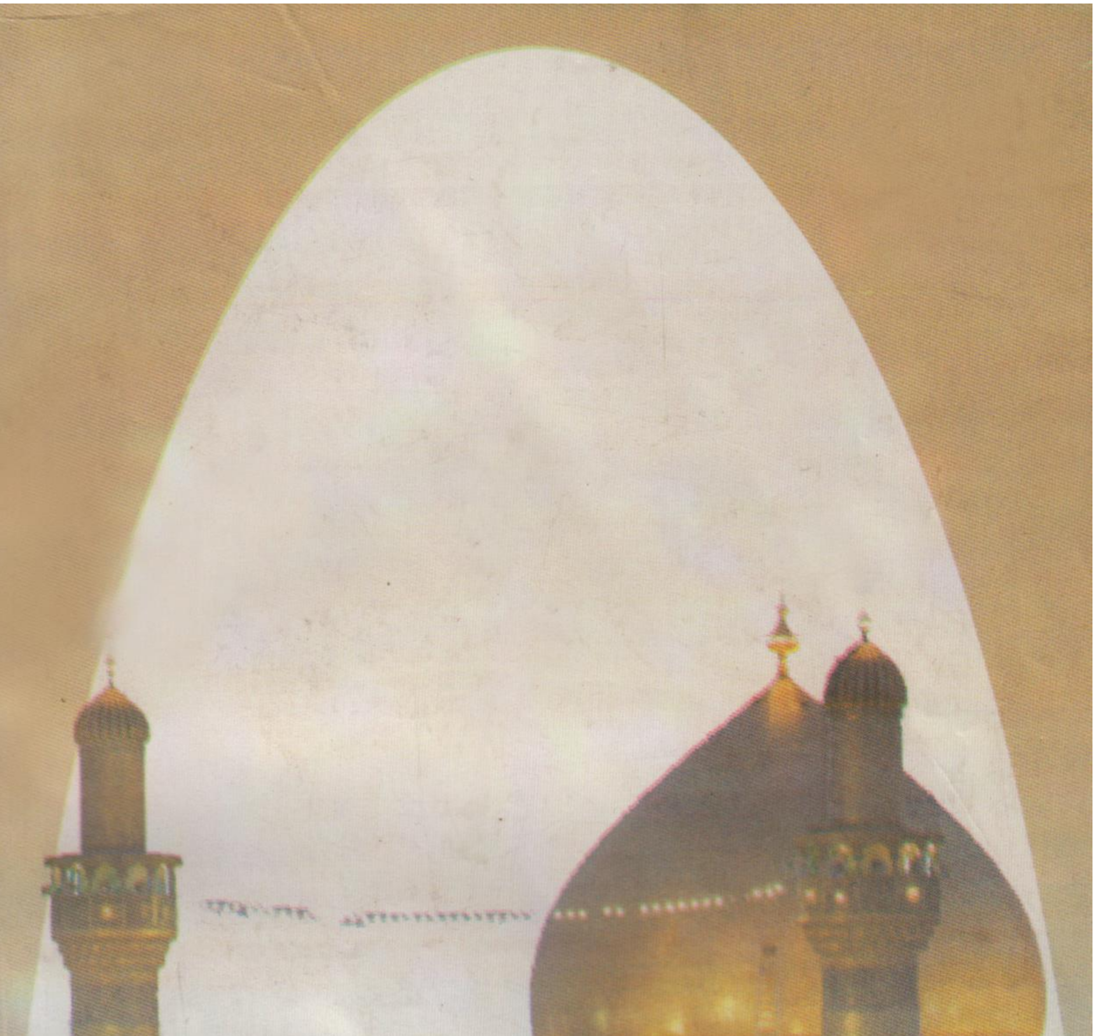


یکی از مطبوعات

**نور الہدیٰ ٹرسٹ** (رجسٹرڈ) **اسلام آباد**

سادات کالونی، بارہ کہو، اسلام آباد فون: 051 2231937